مؤسس : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اکتوبر ۲۰۰۴

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۱۴۱' عدد ۱۰' رمضان ۱۴۲۵ھ' اکتوبر ۲۰۰۴ء

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور- ۵۴۵۷۰

فون : ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@wol.net.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور- ۵۴۶۰۰

فون : ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زرسالانہ: ۲۰۰ روپے

معاونِ خصوصی : ۳۰۰۰ روپے

(بیرونی ایڈیشن: ۳۰ روپے)

بنگلہ دیش' ایران' بھارت: ۶۰۰ روپے

یورپ' مشرق وسطیٰ' مشرق بعید' افریقہ: ۹۰۰ روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا: ۱۲۰۰ روپے

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

۶۰ سال پہلے

انقلاب کے لیے کارکن اور لیڈر

ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ آدمیوں کی جتنی کمی ہے' اُس سے بہت زیادہ کمی تربیت یافتہ آدمیوں کی ہے۔ مجھے اکثر یہ چیز بڑے رنج کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی' خواہ وہ قدیم نظامِ تعلیم سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید نظامِ تعلیم سے' بالعموم اخلاق وشائستگی اور مہذب عادات اور ضبط ونظم کی بالکل ابتدائی اور بنیادی تربیت سے بھی عاری ہوتے ہیں' اور اس کی وجہ سے کوئی اعلیٰ درجے کی جماعت جو کسی نصب العین کے لیے جدوجہد کرسکے' اس ملک میں بنانی نہایت مشکل ہوتی ہے۔ جن قوموں میں اجتماعی تربیت کا نظام مکمل موجود ہے ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں بیشتر افراد مہذب اور منظم زندگی کی بنیادی تربیت حاصل کیے ہوتے ہیں' اور جو شخص کوئی خاص تحریک ان کے اندر جاری کرنا چاہتا ہو اسے ان بنے اور سنورے ہوئے آدمیوں میں صرف اپنی تحریک کے لحاظ سے مناسب اوصاف پیدا کرنے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ بڑی دشواری ہے کہ انسانیت کی بنیادی تربیت ہی بڑی حد تک مفقود ہے' اور یہاں اگر کسی خاص نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی مقصود ہو تو آدمی کو بالکل ناتراشیدہ مواد خام ملتا ہے جسے بالکل نئے سرے سے تراشنے اور سنوارنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں دماغی تربیت سے زیادہ اخلاقی تربیت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں اپنی اس دعوت کے لیے صحیح قسم کے کارکن میسر آسکیں جن کی نایابی کی وجہ سے ہمارا یہ کام ہماری انتہائی کوششوں کے باوجود آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان تمام ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اِس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی' فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور کارکن تیار کریں۔ اس کام کے لیے ڈاکٹری یا انجینیرنگ یا سائنس وغیرہ کے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دین اسلام اور علومِ اجتماعیہ (social sciences) میں اعلیٰ درجے کی بصیرت رکھتے ہوں۔ آگے چل کر جیسا جیسا ہماری کارروائیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اور ہمارے اوپر ذمہ داریوں کا جتنا جتنا بار بڑھتا جائے گا' اس کے لحاظ سے جن جن علمی شعبوں کے اضافے کی ضرورت ہوگی' ان کا اضافہ ہم کرتے جائیں گے۔ (''رودادِ مجلس تعلیمی''، میاں طفیل محمد' ترجمان القرآن ' جلد ۲۵' عدد ۱-۴' رجب تا شوال ۱۳۶۳ھ' جولائی تا اکتوبر ۱۹۴۴ء' ص ۱۰۶-۱۰۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

شوکت آمد و جمالی رفت!

چند اہم سیاسی، دفاعی اور بین الاقوامی مضمرات

پاکستان کی تاریخ بہت سے عجوبوں کے تذکرے سے مالا مال ہے لیکن اس میں تازہ ترین اضافہ دو مہینوں میں تین وزرائے اعظم کا دورِ حکمرانی ہے جسے جنرل پرویز مشرف کا ''ہیٹ ٹرک'' بھی کہا جاسکتا ہے۔

۲۵ جون ۲۰۰۴ء کو ڈیڑھ سال سے وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالے رکھنے والے جناب ظفراللہ خان جمالی نے ان افواہوں کی تردید کی جو ان کی وزارت عظمیٰ سے رخصتی کے بارے میں چند ہفتے سے گردش کر رہی تھیں، اور پھر اچانک ایک دن بعد ہی اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کر کے ''میوزیکل چیرز'' کے ایک کھیل کا آغاز فرمایا جس میں چودھری شجاعت حسین کو ایک قسم کے سیاسی حلالے کے طور پر وزیراعظم مقرر کیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ چودھری صاحب ۵۷ دن وزیراعظم رہے اور اس اثنا میں جناب شوکت عزیز کا قومی اسمبلی میں انتخاب، قائد ایوان کی حیثیت سے تقرر اور پھر بالآخر ۲۸ اگست ۲۰۰۴ء کو وزیراعظم کی حیثیت سے حلف برداری واقع ہوئی۔ اس طرح ۲۶ جون کو شروع ہونے والے ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا اور دنیا کی سیاسی تاریخ میں پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہوگیا کہ اس نے دو مہینوں میں تین وزرائے اعظم کے اقتدار کا نظارہ دیکھ لیا۔ اس سب کے نتیجے میں پانچ درجن سے زیادہ وزرا پر مشتمل کابینہ ملک کا مقدر بن گئی۔ اس میں ابھی مسلسل اضافے متوقع ہے۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جنرل صاحب کے الفاظ میں اس کھیل کو پاکستان کی سیاسی تاریخ کے

most smooth and democratic transition (سب سے زیادہ ہموار اور جمہوری انتقالِ اقتدار) کا نام دیا گیا۔ اور کولن پاول صاحب نے نہلے پہ دہلا مارتے ہوئے یہاں تک فرما دیا کہ اب پاکستان کو ایک بااختیار وزیراعظم (empowered prime minister) میسر آ گیا ہے!! اور اسی ''ڈھول ڈھمکے'' میں جنرل پرویز مشرف صاحب نے بھی، جو کھلے عام ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء سے پہلے آرمی چیف کی وردی اتارنے کا وعدہ قوم اور دنیا سے کر چکے تھے، ایک قلابازی کھائی اور اس بارے میں جو ابہام وہ اور ان کے گماشتے چند مہینوں سے پیدا کر رہے تھے، اسے تقریباً کھلے طور پر وردی نہ اتارنے کے ارادے کے اظہار کی شکل دے دی۔

یہ تمام واقعات ایسے ہیں کہ ان پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے اور جو نیا سیاسی نقشہ مرتب ہو رہا ہے اس کے ادراک اور مضمرات کا احاطہ ایک اہم قومی ضرورت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس وقت کچھ اور اہم موضوعات بھی ہمارے سامنے ہیں، جیسے: وزیرستان میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف فوج کشی، بلوچستان کے مخدوش حالات، عراق کی ہولناک صورت حال، بسلان کا سانحہ، شیشان میں بے پایاں ظلم اور روس کے نئے عزائم، فلسطین اور کشمیر کے تازہ واقعات اور امریکا کا صدارتی معرکہ، جن میں سے ہر ایک مفصل تجزیے و تبصرے کا متقاضی ہے لیکن ان سب کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم ملک میں تازہ ترین سیاسی مہم کاری (political engineering) اور اس کے مضمرات پر ملک و قوم کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

سیاسی بحث میں شخصیات کا تذکرہ فطری ہے اور ناگزیر بھی۔ لیکن ہماری دل چسپی کا اصل مرکز و محور ملک و قوم کے مقاصد اور مفادات ہیں اور حقیقی ہدف پالیسی اور اداروں کی اصلاح اور استحکام ہے۔ جب کوئی شخص پبلک لائف میں قدم رکھتا ہے تو گویا وہ خود کو اجتماعی احتساب کے لیے بھی پیش کرتا ہے اور اسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ البتہ ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے

کہ قومی امور کو زیر بحث لاتے ہوئے ذاتی معاملات اور معاشرتی تعلقات سے بالا ہو کر گفتگو کریں۔ جن محترم شخصیات کا ذکر اس بحث میں آیا ہے یا آئے گا، ان کے بارے میں ہماری بحث کا محور ان کی ذات نہیں بلکہ ان کے افکار، کردار اور اجتماعی رول ہے۔ ہمارا اصل مقصد پاکستان کا نظریاتی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی استحکام ہے اور یہی وہ قدر مشترک ہے جو اس ملک کے تمام خیرخواہوں کو تنقید و احتساب اور تعمیر و ترقی کے لیے سرگرم کرتی ہے۔

وزیراعظم جمالی کا استعفا

جس عمل کو ہم نے سیاسی مہم کاری کہا ہے اس کا سب سے اولین اظہار سابق وزیراعظم جناب ظفراللہ خان جمالی کی فارغ خطی اور اس کے اسباب اور طریق کار ہے۔ جمالی صاحب کو ایوان نے اپنا باقاعدہ قائد منتخب کیا تھا اور وہ کابینی حکومت (cabinet government) کے سربراہ تھے۔ اگر ان کی پالیسیوں پر عدمِ اعتماد تھا تو پارٹی اور پارلیمنٹ کو ان پر بحث کرنی چاہیے تھی، ان کا احتساب کیا جانا چاہیے تھا اور کھلے انداز میں معروف پارلیمانی ضابطوں کے مطابق ان کو ہٹایا جا سکتا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ صدر صاحب اپنے پارلیمانی چیمبر میں فوجی وردی میں پہلی بار تشریف لائے اور سرکاری پارٹی کے ارکان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتیجے میں ارکان اسمبلی نے ان کے سامنے شکایات کا دفتر کھول دیا ہے۔ جنرل صاحب نے کابینہ اور اسمبلی کی کارکردگی کے بارے میں اپنے تحفظات اور تنقیدات کا کھلا اظہار کیا۔ چند وزیروں کے بدعنوان ہونے کا ذکر بھی فرمایا۔ محلاتی سازشوں کے اس پس منظر میں خود جمالی صاحب کئی دن تک وزارتِ عظمٰی سے فارغ کیے جانے کی افواہوں کی تردید کرتے رہے مگر دوسرے ہی دن اچانک اپنے استعفے کا اعلان کر دیا بلکہ متبادل وزیراعظم کی نامزدگی بھی کر دی۔ اس پورے عرصے میں صدر پرویز مشرف اور چودھری شجاعت حسین بھی ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے رہے۔ البتہ سیاسی حلقوں میں یہ چہ مے گوئیاں ہوتی رہیں کہ وردی کے مسئلے پر صدر صاحب کی فرمایش کے مطابق دوٹوک بات نہ کہنے، عراق فوج بھیجنے کے معاملے میں عوامی جذبات کے احترام کا عندیہ دینے، حدود قوانین اور ناموس رسالتؐ کے قانون میں تبدیلی کے بارے میں تحفظات کے

اظہار اور خود قومی سلامتی کونسل کے سلسلے میں کچھ دبے دبے احساسات کی بنا پر وہ صدر صاحب کا اعتماد کھو چکے ہیں اور 'باس' کی ناراضی مول لے چکے ہیں جس کی قیمت انھیں ادا کرنی پڑی۔

جمالی صاحب کو جس طرح اور جس عجلت میں فارغ کیا گیا' اس نے تمام پارلیمانی طور طریقوں' ضابطوں اور روایات کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کو ۱۸ ماہ وزیراعظم رکھنے کے بعد دو ماہ کے لیے بھی گوارا کرنا قبول نہیں کیا گیا اور ایک عبوری وزیراعظم لا کر ایک ایسے اپنے قابلِ اعتماد شخص کو وزیراعظم نامزد کیا جو خواہ کتنا ہی اچھا ٹیکنوکریٹ کیوں نہ ہو لیکن جس کی کوئی سیاسی بنیاد (base) نہ تھی' کوئی حلقہ انتخاب نہ تھا' پارٹی کے نظام میں اس کا کوئی مقام نہیں تھا' کوئی سیاسی تجربہ نہیں تھا' اسے نامزد وزیراعظم کا مقام دے کر اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے لیے دو حلقوں سے انتخاب لڑایا اور ایک کھلے کھلے انتخابی تماشے کے ذریعے منتخب بھی کرایا گیا۔ اٹک میں جو ہوا سو ہوا' مگر مٹھی' (تھرپارکر) میں تو ایسا انتخاب ہوا کہ اس علاقے کے جو روایتی لیڈر تھے ان سے بھی دوگنے اور تین گنے ووٹ کسی طلسماتی عمل کے ذریعے ہونے والے وزیراعظم کو حاصل ہو گئے۔ اس سلسلے میں پاکستان ہیومن رائٹس کمیشن کے نمایندوں کی رپورٹ چشم کشا ہے جو ملک کے انتخابی عمل کے افلاس اور الیکشن کمیشن کی جانب داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انتخابی عمل کو اس طرح پامال کیا گیا کہ اس پر لوگوں کا اعتماد جو پہلے ہی متزلزل تھا' پارہ پارہ ہو گیا ہے اور ملک میں جمہوریت کی بحالی کا جو برا بھلا عمل شروع ہوا تھا' اسے بڑا دھچکا لگا ہے۔

جمالی صاحب کی فارغ خطی کے اسباب آخر ایک نہ ایک دن تو کھل کر سامنے آئیں گے ہی' تاہم ان کے بیانات میں بین السطور کچھ چیزیں نمودار ہونے لگی ہیں۔ لیکن جس بھونڈے اور غیر پارلیمانی انداز میں یہ سارا کام ہوا' اس نے جمہوریت کے فروغ اور ارتقا پر بڑے منفی اثرات ڈالے ہیں۔ یہ اقدام ملک کو بہت پیچھے لے گیا ہے۔

چودھری شجاعت حسین نے عبوری وزیراعظم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں بحیثیت مجموعی وقار کے ساتھ انجام دیں لیکن ان جیسے جہاں دیدہ اور بااثر سیاست دان کا اس پورے عمل کو آگے بڑھانے میں ایسا نمایاں کردار اور ایک انتخابی ڈھونگ کے ذریعے نئی قیادت کو آگے لانے میں ان کا حصہ' کسی صورت میں بھی ان کی نیک نامی کا باعث نہیں ہوا بلکہ ان کی شخصیت کو

داغ دار کرنے کا ذریعہ بنا۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اقتدار کے دو مہینوں میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ جمہوریت کے چہرے کو بگاڑنے' دستور کے تقاضوں کو پامال اور سول نظام اور پارلیمانی اداروں کے استحکام کو مجروح کرنے کا باعث ہوا ہے' اور اس میں ان کے ذاتی رکھ رکھاؤ کے باوجود نتائج کے اعتبار سے ہر بے لاگ مبصر اور تجزیہ نگار کی نگاہ میں ان کا رول منفی اور تکلیف دہ رہا ہے۔

پارلیمانی نظام پر ضرب

دوسرا بنیادی مسئلہ پارلیمانی نظام کے دروبست کی کمزوری بلکہ اس کے نظامِ کار کا درہم برہم ہو جانا ہے۔ یہ محض نظری یا ظاہری ہیئت کا مسئلہ نہیں۔ پارلیمانی نظام میں اقتدار کا سرچشمہ پارلیمنٹ ہوتی ہے جو عوام کی منتخب کردہ اور ان کے سامنے جواب دہ ہے۔ پارلیمانی نظام کا مرکز و محور وزیراعظم بحیثیت ایوان کے قائد اور ان کی کابینہ ہے جو ایوان کے سامنے انفرادی اور اجتماعی طور پر جواب دہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمانی جمہوریت میں پارٹی نظام کے مؤثر ہونے کے باوجود پارٹی کے صدر کے مقابلے میں پارلیمانی لیڈر کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ صرف انگلستان کے ویسٹ منسٹر (westminister) ماڈل ہی کا خاصہ نہیں۔ دنیا میں جہاں بھی پارلیمانی نظام ہے وہاں وزیراعظم چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے اور کابینہ اس کی قیادت میں کام کرتی ہے۔ اگر وزیراعظم کی مرکزی حیثیت نہ ہو اور قوت کا مرکز پارلیمنٹ اور ان کا لیڈر نہیں کوئی اور ہو تو ایسے میں پارلیمانی نظام کام نہیں کرسکتا۔ بھارت میں یہ مسئلہ آزادی کے فوراً بعد رونما ہوا اور اچاریہ کرپلانی جو کانگرس کے صدر تھے اور پنڈت جواہر لعل نہرو جو پارلیمنٹ کے لیڈر اور وزیراعظم تھے کے درمیان رونما ہوا' اور پارلیمانی نظام کے اصول و روایات کے مطابق وزیراعظم کو مرکزی حیثیت دی گئی جو وہاں پارلیمانی جمہوریت کے استحکام کا ذریعہ بنی۔ بھارت کے سیاسی تجزیہ نگار اور تامل ناڈو کے سابق گورنر ڈاکٹر جی سی الیگزنڈر لکھتے ہیں:

> وزیراعظم کے اختیارات کو کم کرنے سے روکنے کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ اس کی پارٹی کے تمام ممبر اور حامی اور اتحادی پارٹیاں پارلیمانی طرزِ جمہوریت کے بنیادی

اصول یعنی ''وزیراعظم کی نظام میں بالادستی'' کو ہمہ وقت اور کسی تحفظ کے بغیر قبول کریں۔ (''پارٹی اور پی ایم'' دی ایشین افیئر' لندن' ۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء' ص ۱۴)

پاکستان میں گذشتہ چند مہینوں میں جو کچھ ہوا ہے اس کا سب سے بڑا نقصان ملک کے پارلیمانی نظام کو ہوا ہے۔ وزیراعظم کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی ہے۔ قوت کا مرکز پارلیمنٹ' پارلیمانی پارٹی اور وزیراعظم اور کابینہ سے ہٹ کر صدر اور چیف آف اسٹاف کا عہدہ اور شخصیت بن گیا ہے۔ ایک غیر سیاسی شخص کو' خواہ وہ اپنے میدان میں کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو' بطور وزیراعظم بنیادی طور پر صدر کی خواہش اور اشارے پر لانا اور اس اہم منصب پر فائز کر دینا ایک طرح سے پارلیمنٹ' پارلیمانی نظام اور خود وزارت عظمٰی کے عہدے کی تنزلی (demotion) ہے۔ اب پالیسی سازی اور قوت کا سرچشمہ صدر' چیف آف اسٹاف ہے جو پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ نہیں اور نہ وہ پارلیمنٹ کی بحثوں میں شریک ہوکر پالیسی سازی اور قانون سازی میں کوئی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ وزیراعظم محض ایک ملازم نہیں' اصل چیف ایگزیکٹو ہے۔ اب صاف نظر آ رہا ہے کہ جنرل مشرف ایک بار پھر کھلے کھلے چیف ایگزیکٹو بن گئے ہیں' تمام پالیسی فیصلے وہی کر رہے ہیں اور وہی ان کا اعلان بھی کر رہے ہیں' جب کہ وزیراعظم برملا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ جنرل صاحب کی پالیسی کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس طرح پارلیمانی نظام کے دستوری ڈھانچے پر صدارتی نظام مسلط (superimpose) کر دیا گیا ہے جس نے دستور کے ڈھانچے کا تیاپانچا کر دیا ہے اور دستور اور قانون کی حکمرانی عملاً ختم ہوگئی ہے۔ اس میں جو بھی' جس درجے میں بھی' جن وجوہ کی بنا پر بھی شریک ہوا ہے' وہ اس بگاڑ کا ذمہ دار ہے۔ پوری قوم اس کے تلخ نتائج کو بھگت رہی ہے اور مزید بھگتے گی۔

داغ داغ جمہوریت

تیسرا پہلو صدر' وزیراعظم' کابینہ اور پارلیمنٹ کے باہمی تعلق اور رول کا ہے۔ جناب شوکت عزیز صاحب جس طرح وزیراعظم بنے ہیں وہ معروف سیاسی عمل کے حلیہ بگاڑنے کے مترادف ہے۔ کیا پوری قومی اسمبلی میں ایک شخص بھی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لائق نہیں تھا

کہ باہر سے ایک فرد کو لانا پڑا۔ پھر انتخاب میں جو کچھ ہوا وہ جمہوریت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اپوزیشن کے نمایندے کو پارلیمنٹ میں آنے اور انتخابی مہم چلانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ایک طرف ایک شخص کو قائد ایوان کے انتخاب کے لیے اہل قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے اجلاس میں شرکت کے لیے نہیں بلایا جاتا۔ شوکت عزیز صاحب نے کہا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جاوید ہاشمی صاحب کو شرکت کا موقع دیا جائے۔ پھر کس چیز نے اسپیکر کو روک دیا؟ محض ایک تقریر کا خوف؟ کیا یہی شفاف جمہوریت ہے؟

انتخاب کے بعد شوکت عزیز صاحب نے یہ عندیہ دیا کہ ان کی کابینہ صرف میرٹ کی بنیاد پر بنائی جائے گی اور اہل ترین افراد اس میں ہوں گے۔ لیکن جمالی صاحب کی کابینہ کے سارے ارکان ان کی کابینہ کی زینت بھی بن گئے اور صدر صاحب کا کابینہ کی کارکردگی پر اظہار خیال اور چند افراد کی کرپشن کی بات' سب پادر ہوا ہوگئی۔ پھر سیاسی جوڑ توڑ اور مختلف گروپوں کے ساتھ ملانے کا عمل شروع ہوا اور ناراض عناصر کو راضی کرنے کے کرشمے سب کے سامنے آگئے۔ پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی کابینہ بنی ہے اور اگر کہیں محکموں کی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ بھی برائے نام۔ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ایک رکن پر الزامات اور ان کے جوابی الزامات اخبارات کی زینت بن چکے ہیں ان کا صرف محکمہ تبدیل کر دیا گیا اور ایک دوسرے صاحب کو وہ محکمہ دے دیا گیا' اور لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی بزرگ نیب کے مطلوبہ افراد میں سے ہیں اور وزارت بھی ان کو داخلہ کی دی گئی ہے۔ یہ بھی سوالیہ نشان ہے کہ جمالی صاحب جواب وزیراعظم نہیں رہے اور دو وزرا کا جن کے محکموں کو تبدیل کیا گیا ہے تعلق بلوچستان سے ہے۔ کابینہ کی تشکیل اور بندر بانٹ نے میرٹ کے وعدے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

مبصرین کے اس خدشے کو یہاں نوٹ کیا جانا بے محل نہیں کہ کابینہ کے بنانے میں وزیراعظم اور ان کے اعلان کردہ اصولوں کا رول نہ ہونے کے برابر ہے' اور کابینہ ان کو ایک طرح سے ورثے میں ملی ہے اور اضافے کسی اور کے اشارے پر ہوئے ہیں' حتیٰ کہ لندن والوں سے رابطے کے لیے صدر کے نمایندہ خاص نے ہی جا کر معاملات طے کیے ہیں۔ اس سب کا حاصل یہ ہے کہ کابینہ جس طرح بنی ہے وہ خود پارلیمانی نظام کے اصول وضوابط سے مطابقت نہیں رکھتا اور

خطرہ ہے کہ یہ پارلیمانی نظام کے صحت مند ارتقا پر ایک ضرب کاری ثابت ہوگی۔

وزیراعظم کی گرفت کابینہ پر ڈھیلی ہوگی۔ وفاداری کا مرکز کہیں اور ہوگا اور اس طرح اتنی بڑی کابینہ ایک مربوط اور ہم آہنگ ٹیم کی طرح کام نہیں کر سکے گی۔ وزیراعظم پر ایک طرف اوپر والوں کا دباؤ ہوگا اور دوسری طرف سے پارٹی کے بااثر گروہوں' افراد اور ان کے مطالبات کا۔ ہدایت اور رہنمائی کا منبع کہیں اور ہوگا اور پارلیمنٹ ملک کو اچھی حکمرانی فراہم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ خارجہ پالیسی ہو یا داخلہ پالیسی' سب اس انتشار اور رسہ کشی کا شکار ہوں گے۔ خدا کرے یہ خدشات غلط ثابت ہوں لیکن جس طرح معاملات رونما ہو رہے ہیں ان سے صاف نظر آ رہا ہے کہ حکمرانی کا نظام یک مرکزیت سے محروم اور دوہری عمل داری (diarchy) بلکہ ایک نئی قسم کی سہ نکاتی تشکیل (troika) کی طرف جا رہا ہے جسے کسی پہلو سے بھی اچھا شگون قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ٹیکنو کریٹ وزیراعظم کے لیے بھی بیک وقت کئی خداؤں کی بندگی کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکال سکتی۔

نیا سیاسی کلچر

چوتھا پہلو نئے سیاسی کلچر کا ہے جو بالکل نیا تو نہیں لیکن وہ ان خرابیوں کو مستحکم اور دائمی کرتا جا رہا ہے جو ماضی میں بگاڑ اور تباہی کا سبب رہی ہیں اور جن کی موجودگی میں صحت مند جمہوری نظام اور انصاف' حق اور میرٹ پر مبنی اور کرپشن سے پاک اجتماعی زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے تو تبدیلی کے اس عمل پر نہ صرف اطمینان کا اظہار کیا ہے بلکہ اسے مثبت قرار دیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے: ''میں ملک میں ایک اچھی تبدیلی دیکھ رہا ہوں اور ایک نئے سیاسی کلچر کا آغاز ہو رہا ہے''۔

یہ نیا سیاسی کلچر کیا ہے؟ وہی جاگیردار طبقے کی بالادستی' وفاداریوں کی چشم زدن میں تبدیلی کا وہی کھیل جو پاکستان کی تاریخ میں مسلسل کھیلا جاتا رہا ہے: وزیراعظم ناظم الدین (جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے) کے ارکان پارلیمنٹ کا ان کے اپنے کیمپ سے نکل کر غلام محمد اور محمد علی بوگرہ سے جا ملنا' ری پبلکن پارٹی کے پرچم تلے مسلم لیگیوں کے غول کے غول کا ڈاکٹر خان

اور گورمانی کی طرف منتقل ہو جانا' کونسل اور کنونشن لیگ کے ڈرامے--- جو افراد آج شوکت عزیز صاحب کے دست راست ہیں اور جنرل پرویز مشرف کی وردی کے گن گا رہے ہیں' کل وہی جنرل ایوب کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے' جنرل یحیٰی کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے' جنرل ضیاء الحق کی کرسی مضبوط کر رہے تھے' نواز شریف صاحب پر جان چھڑک رہے تھے' بے نظیر کی وفاداریوں کے حلف اٹھا رہے تھے' ظفراللہ جمالی کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ ان کے لیے سیاسی قبلہ بدلنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی ان کی فطرت اور چڑھتے سورج کی پوجا ان کا مستقل دین ہے۔ وزارتیں اور مفادات ان کا اصل مطلوب و مقصود ہیں۔ ان کی ''جمہوریت پسندی'' ان کو فوجی قیادت کو اقتدار کی دعوت دینے اور دستور اور قانون کو بالائے طاق رکھنے سے باز نہیں رکھتی' اور یہ صدارت اور فوج کی سربراہی کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس میں ان کو اپنا اور جمہوریت کا مفاد نظر آنے لگتا ہے۔ ہوا کے رخ کے ساتھ بدلنا ان کی نگاہ میں ترقی کی علامت ہے۔ ملک اور اس کے اداروں پر چاہے کچھ بھی گزر رہے!

جنرل پرویز مشرف اصول پرستی اور سیاست میں گندگی سے نجات کے دعوے کے ساتھ برسرِ اقتدار آئے تھے مگر وہ ایک ایک کر کے ہر وہ کام کر رہے ہیں جو بدنامِ زمانہ سیاست دان اور اقتدار کے بھوکے بیوروکریٹس اور جرنیل کرتے رہے ہیں۔ حلف کی خلاف ورزی' وعدوں کو نظرانداز کرنا' اپنی ذات کو ریاست کے مترادف بنالینا' پارٹیاں چھوڑنے والوں کو سینے سے لگانا' وزارتوں کے لیے بلیک میل ہونا اور ہر طالع آزما کو ایک ٹکڑا دے کر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کرنا--- کیا یہی وہ مثبت تبدیلی ہے جس کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے اور اسی کا نام نیا سیاسی کلچر ہے؟ پاکستان بلاشبہہ بہت سے بیرونی خطرات سے دوچار ہے' لیکن اس کی سلامتی اور ترقی کو سب سے بڑا خطرہ گھر کے ان ہی لوگوں سے ہے۔ مفاد اور قوت کی پرستش کا یہی وہ کلچر ہے جس نے جمہوریت کو پراگندا کر دیا ہے' معاشرہ فساد کا شکار ہے' عوام مصائب میں مبتلا ہیں اور اصحاب اقتدار دادِ عیش دے رہے ہیں۔ ایسے دوستوں کی موجودگی میں دشمنوں سے کیا خطرہ۔ حالیہ تبدیلی نے اس کلچر کے چہرے سے ہر پردہ اٹھا دیا ہے اور اس

ڈرامے کے تمام کردار بے نقاب ہو گئے ہیں۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ جب ایک قوم اس راستے پر چل پڑتی ہے تو پھر اسے تباہی سے اگر کوئی چیز بچاسکتی ہے تو وہ ایسا انقلاب ہے جو پورے نظام کو زیروزبر کردیتا ہے--- کاش اس سے پہلے قوم کی آنکھیں کھل جائیں اور گاڑی کو پٹڑی پر لے آیا جائے۔

فوج کا سیاسی کردار

موجودہ سیاسی منظر اور پس منظر کا سب سے اہم اور سب سے تشویش ناک پہلو ملک کے سیاسی نظام میں فوج کے سیاسی کردار کا ہے اور ان دو مہینوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا ایک مرکزی پہلو اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ اندر اندر جو کھچڑی پکتی رہی ہے اس کا اصل ہدف فوج کی قیادت کو ایک دستوری اور سیاسی کردار عطا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی تاریخ کوئی اچھی تصویر پیش نہیں کرتی۔ اصولی طور پر فوج کا کام ملک کا دفاع ہے اور فوج کو مکمل طور پر سیاسی قیادت کے تابع ہونا چاہیے۔ یہ جمہوریت کی اصل روح ہے اور کیسی ہی ملمع سازی کی جائے' فوج کو دفاع سے ہٹا کر کوئی سیاسی کردار دینا اصولی اور عملی ہر دو پہلوؤں سے ناقابلِ تصور اور عملی اعتبار سے ملک کی سیاست اور دفاع دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔

قائداعظمؒ نے ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ اسٹاف کالج کے فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ فوج سول نظام کے تابع اور اس کے احکام اور ہدایات کی پابند ہے اور یہی خود ان کے اس حلف کا تقاضا ہے جو وہ فوج میں شمولیت کے وقت اٹھاتے ہیں۔ دستورِ پاکستان میں یہی بات اعلیٰ ترین قانون کی حیثیت سے رقم کر دی گئی ہے۔ دستور کی دفعات ۲۴۴ اور ۲۴۵ بالکل واضح ہیں۔ دفعہ ۲۴۵ کہتی ہے:

> مسلح افواج' وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت' بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی اور قانون کے تابع شہری حکام کی امداد میں' جب ایسا کرنے کے لیے طلب کی جائیں' کام کریں گی۔

اور دفعہ ۲۴۴ کے تحت حلف ان کے کردار اور ان حدود کی وضاحت کر دیتا ہے جن میں رہ کر انھیں

اپنے فرائض انجام دیتے ہیں:

میں .... صدق دل سے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی حمایت کروں گا جو عوام کی خواہشات کا مظہر ہے' اور یہ کہ میں اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول نہیں کروں گا' اور یہ کہ میں مقتضیات قانون کے مطابق اور اس کے تحت پاکستان کی برّی فوج (یا بحری یا فضائی فوج) میں پاکستان کی خدمت ایمان داری اور وفاداری کے ساتھ انجام دوں گا۔

اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے' آمین!

ہماری عدالتوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر کے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت فوج کی بار بار سیاسی مداخلت کو جو جواز فراہم کیا ہے اس نے سیاسی نظام کا حلیہ بگاڑ دیا ہے' اور ہر طالع آزما کو سیاسی نظام کی بساط لپیٹنے اور ''قومی مفاد'' کے نام پر فوجی اقتدار قائم کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ سیاسی قیادتوں اور خود عوام نے بھی اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا اور آج عالم یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف صاحب ایک نیا فلسفہ وضع فرما رہے ہیں کہ گویا فوج کو سیاست میں مداخلت کا ایک دائمی اختیار حاصل ہے۔ قائداعظم کے اس ارشاد کی ضد میں اور بالکل ان کے مدمقابل آتے ہوئے کوئٹہ ہی میں فوج کے گیریزن کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

ہمیں اپنے ملک کا محض دفاع ہی نہیں کرنا ہے بلکہ ایک نئے وژن کے ساتھ اسے ترقی بھی دینا ہے' اور کوئی دوسرا ہمارے لیے اس کو نہیں کرے گا۔

جنرل صاحب کے قومی سلامتی کونسل کے تصور اور دستور کی سترھویں ترمیم کے موقع پر ان کے' سرکاری جماعت کی پوری قیادت کے' بلکہ ساری پارلیمنٹ کے عہدوپیمان کے باوجود ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد بھی چیف آف اسٹاف کے عہدے سے چمٹے رہنے کے عزائم کے اظہار کی اصل حقیقت کو فوج کے اس تبدیل شدہ سیاسی کردار کے پس منظر میں ٹھیک ٹھیک سمجھا جاسکتا ہے۔ مسئلہ بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے اور اب اسے ہمیشہ کے لیے طے ہو جانا چاہیے۔ یا فوج ایک دفاعی قوت ہوگی اور اس شکل میں اسے سیاسی قیادت کے تابع ہونا ہوگا اور سیاسی نظام کے بنانے

اور چلانے میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوسکتا۔ اور اگر فوجی قیادت کا سیاسی نظام کو بنانے اور چلانے میں کوئی کردار ہوگا تو پھر فوج ایک سیاسی پارٹی اور قوت بن جاتی ہے اور وہ پورے ملک اور پوری قوم کی امیدوں کا مرکز اور تائید کا محور نہیں رہ سکتی۔ پھر اس پر بھی اسی طرح تنقید ہوگی جس طرح تمام سیاسی قوتوں پر ہوتی ہے۔ پھر وہ بھی ایک پارٹی اور ایک گروہ کی نمایندہ بن جاتی ہے، پھر وہ بھی حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں سے ایک کی حلیف بنتی ہے، پھر وہ بھی سیاسی طور پر متنازع بن جاتی ہے۔ پھر وہ بھی مفادات کی جنگ میں ایک مخصوص حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ایسی فوج کبھی بھی پوری قوم کی تائید کی دعوے دار نہیں ہوسکتی۔ ایسی فوج کی دفاعی صلاحیت بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس میں بھی اسی طرح پارٹی بازی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور جنبہ داری کا مرض لگ جاتا ہے۔ ایسی فوج کی پیشہ ورانہ حیثیت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور فوج کو جس ذہنی افتاد، جس ڈسپلن اور جس غیر جانب داری کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہوجاتی ہے۔

سب سے بڑھ کر دستوری حکومت اور خصوصیت سے جمہوری نظام میں فوج کے ایسے کردار کا تصور ممکن نہیں۔ آج ترکی کے یورپی یونین میں داخلے کے سلسلے میں جو سب سے اہم بحث ہورہی ہے ان کا تعلق فوج کے سیاسی کردار ہی سے ہے اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ فوج کو غیر سیاسی کیے بغیر ترکی کے جمہوری کردار کو دنیا تسلیم نہیں کرسکتی۔ ہمارا بھی یہی مسئلہ ہے کہ فوج کی قیادت ایک سیاسی کردار بن گئی ہے اور جب تک اس باب کو واضح طور پر بند نہیں کیا جاتا، ملک میں سیاسی استحکام محال ہے اور ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے نہ ملک کے عوام اس پر مطمئن ہوں گے اور نہ دنیا اسے قبول کرے گی۔

اگر ہم اپنی ۵۷ سالہ تاریخ کا جائزہ لیں تو اس میں ۲۳ وزیراعظم آئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا اوسط اقتدار اڑھائی سال رہا ہے بلکہ صحیح تر الفاظ میں اگر فوجی اقتدار کے زمانے کو نکال دیا جائے تو یہ اوسط کم ہوکر سوا سال ہی رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس فوج کے چیف آف اسٹاف کی صدارت کا زمانہ ۳۰ سال ہے جس میں ۴ فوجی سربراہ صدر رہے ہیں۔ گویا ان کا اوسط اقتدار ساڑھے سات سال تھا۔ ان ۵۷ برسوں میں فوج کے ۱۱ چیف آف اسٹاف رہے ہیں اور

ان کی چیف آف اسٹاف ہونے کی اوسط مدت قواعد کے مطابق تین سال کے بجاے ۵ سال سے زیادہ آتی ہے۔ فوجی قیادت ملک کو نہ سیاسی استحکام دے سکی' نہ معاشی ترقی میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا اور دفاعی اعتبار سے بھی ۱۹۶۵ء کے معرکے کے بعد فوج اعلیٰ دفاعی صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکی۔ فوج کو ایک مؤثر دفاعی قوت بنانے کا ایک ہی راستہ ہے اور یہ کہ وہ خالص پروفیشنل فوج ہو' اس کی ہر جائز ضرورت پوری ہو' لیکن سیاست میں اس کی دخل اندازی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں عوام' پارلیمنٹ' سیاسی جماعتیں اور عدالت ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور خود فوج کی قیادت کو بھی یکسو ہونا پڑے گا کہ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سفر نہیں کر سکتی۔

سترھویں ترمیم اور وردی

ان حالات میں سترھویں ترمیم کے ذریعے یہ طے کیا گیا کہ دستوری انحراف کا یہ دروازہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو بند ہو جانا چاہیے اور اس کے بعد فوج اور اس کا سربراہ صرف دفاعی ضرورتوں تک اپنی صلاحیتوں کو وقف رکھے گا اور سیاسی قیادت سیاسی طریقے سے عوام کے نمایندوں اور پارلیمنٹ اور دستور کے تحت اپنا کردار ادا کرے گی۔ اس عہد سے نکلنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے وہ قانونی' سیاسی اور اخلاقی' ہر اعتبار سے مجرمانہ اقدام ہے جسے کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم نے اب بھی اپنے ماضی سے کوئی سبق نہ سیکھا تو اس ملک میں جمہوریت' قانون کی بالادستی اور عوام کے حق حکمرانی کا مستقبل مخدوش ہے اور ملک کا دفاع بھی بری طرح متاثر ہوگا۔

اس سلسلے میں بظاہر جو دلائل دیے جا رہے ہیں وہ نہایت بودے بلکہ لچر ہیں۔ بنیادی طور پر تین باتیں کہی گئی ہیں جن کا تجزیہ ضروری ہے۔

○ **دستور کے تحت دونوں عُھدوں کا ساتھ**: پہلی بات دستور کے حوالے سے کہی جا رہی ہے کہ دونوں عہدے ساتھ ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ لغو دعویٰ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہہ ہمارا دستور بار بار فوجی قیادتوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنا ہے اور اس

سے اسے بری طرح نقصان ہوا ہے لیکن ہر دستور کا ایک ڈھانچا (structure) ہوتا ہے اور اس ڈھانچے میں فوج کے سیاسی کردار کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسی لیے جنرل ضیاء الحق نے اور پھر جنرل پرویز مشرف نے اپنے اپنے دور میں اپنے لیے دستور میں خصوصی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو عارضی تھی اور اس کی حیثیت دستور سے انحراف کی تھی جسے بہ حالت مجبوری وقتی طور پر اور ایک متعین مدت کے لیے گوارا کیا گیا جس کے بعد اسے لازماً ختم ہوجانا تھا۔ سترھویں ترمیم میں آرٹیکل ۴۱ کے تحت ترمیم کا جواز ہی یہ تھا کہ چیف آف اسٹاف کے عہدے کو صدارت کے ساتھ جمع کرنے کو ایک تاریخ کا پابند کر دیا جائے۔ اسے دستور کی اصطلاح میں Musharruf-specific بھی کہا جاسکتا ہے اور عمومی طور پر ہر چیف آف اسٹاف پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اگر یہ مقصد نہیں تھا تو پھر اس ترمیم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب جو قانونی موشگافیاں کی جارہی ہیں وہ بدنیتی اور عہد فراموشی پر مبنی ہیں اور اس کے سوا ان کو کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ دفعہ d(۱)۶۳ میں سروس آف پاکستان کا تصور واضح ہے اور دفعہ ۲۶۰ میں مزید وضاحت موجود ہے کہ فوجی سروس اس میں شامل ہے۔ اس سے ہٹ کر اس کی کوئی تعبیر دستوری تعبیر کے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ notwithstanding کا اطلاق پوری دفعہ ۴۱ پر ہوتا ہے۔ اس کے صرف کسی ایک حصے تک اس کو محدود نہیں رکھا جاسکتا اور قانون کے ذریعے ترمیم کے معنی یہ ہیں کہ چیف آف اسٹاف کا تعلق ''آرمڈ سروسز'' سے نہیں رہے گا' نیز یہ کسی ایک فرد تک محدود نہیں ہوسکتا بلکہ اس عہدے کو سروس سے باہر کرنا پڑے گا۔ لیکن کیا اس کا تصور ممکن ہے کہ چیف آف اسٹاف ''فوجی سروس'' کا حصہ نہ رہے اور پھر چیف آف اسٹاف بھی ہو--- یہ ایک مضحکہ خیز اور سیاسی نظام اور فوجی انتظام دونوں کو تہ و بالا کرنے والا تصور ہی ہوسکتا ہے۔ دستور و قانون میں اس کی کوئی گنجایش نہیں۔

○ **ایم ایم اے سے معاھدہ:** دوسری دلیل سیاسی ہے کہ ایم ایم اے سے جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ مؤثر نہیں رہا۔ ان کے بقول ایم ایم اے نے اس کی پابندی نہیں کی' اس لیے صدر صاحب بھی اس کی خلاف ورزی کرسکتے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی غلط اور بددیانتی پر مبنی ہے۔ صدر صاحب اور ایم ایم اے میں کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ معاہدہ حکمران پارٹی اور ایم ایم اے میں ہوا جس کے نتیجے

میں دستور میں ترمیم ہوئی اور وہ ایک دستوری تقاضا بن گیا جس کو کھلے طور پر صدر صاحب نے قبول کیا اور قوم سے عہد کیا کہ وہ اس کا احترام کریں گے۔ اب اصل معاملہ دستور کی اطاعت کا ہے' کسی خاص معاہدے کا نہیں۔

رہا ایم ایم اے کا معاملہ تو اس نے معاہدے کی مکمل پابندی کی ہے اور آج بھی اس پر قائم ہے۔ اس نے معاہدے کے تحت سترھویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیا اور صدر' وزیراعظم اور حکمران پارٹی نے اس کا برملا اعتراف کیا۔ اس معاہدے کے تحت ایم ایم اے صدر کو اعتماد کا ووٹ دینے کی پابند نہیں تھی بلکہ معاہدے میں صاف لفظوں میں لکھا ہوا تھا کہ:

> طے پایا کہ صدرمملکت کی پانچ سالہ جاری ٹرم کے تسلسل اور ان کے اس عہدے پر فائز رہنے کے لیے آئینی ترمیم کی حمایت کی جائے گی۔ مزید برآں سینیٹ' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں ایم ایم اے کے ممبران صدر کو اعتماد کا ووٹ دینے کے پابند نہ ہوں گے۔ ایم ایم اے کے ممبران صدرمملکت کے خلاف ووٹ نہیں دیں گے اور نہ کسی مخالفانہ فعالیت کا مظاہرہ کریں گے' نیز ووٹنگ کے عمل کے دوران ایم ایم اے کے تمام ممبران پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ایوانوں میں موجود رہیں گے۔

ایم ایم اے نے اس معاہدے کی حرف بہ حرف پابندی کی۔

رہا مسئلہ قومی سلامتی کونسل کا' تو ایم ایم اے نے اس دفعہ کو دستور سے خارج کرانے کا ہدف حاصل کیا۔ جہاں تک عام قانون کے تحت ایسے ادارے کے قیام کا تعلق ہے' ایم ایم اے نے تعاون کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ مذاکرات کے لیے تیار تھی لیکن حکومت نے اس قانون سازی میں ایم ایم اے سے کسی بات چیت کی زحمت تک نہ کی۔ پھر بھی ایم ایم اے نے قومی اسمبلی اور سینیٹ دونوں میں متعلقہ قانون میں اپنی ترامیم داخل کرائیں جو اس کے اس عندیہ کی علامت ہے کہ وہ اس معاملے میں کوئی درمیانی راہ نکالنا چاہتی تھی جسے حکومت نے درخوراعتنا نہ سمجھا۔ لہٰذا ایم ایم اے کی طرف سے کوئی وعدہ خلافی نہیں ہوئی۔

رہا صدر کا معاملہ تو انھوں نے اپنے ٹی وی خطاب میں قوم سے ہی نہیں' پوری دنیا سے بہت واضح الفاظ میں عہد کیا کہ انھوں نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک چیف آف اسٹاف کے عہدے

سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ان کے الفاظ بہت اہم ہیں:

آخری مسئلہ وردی تھا۔ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ میں نے پاکستان اور بیرونی دنیا میں ہمیشہ یہ کہا کہ صدر کا وردی میں ہونا جمہوریت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ غیر جمہوری بات ہے لیکن پاکستان کے حالات کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں کہتا رہا ہوں کہ مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ جمہوری نہیں ہے اور مجھے کسی مرحلے پر یہ وردی اتارنا ہوگی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بہت سے خیر خواہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنی وردی نہ اتاروں کیونکہ وہ پاکستان کی سلامتی کے لیے فکرمند ہیں' میں بھی پاکستان کی سلامتی کے لیے فکرمند ہوں' مجھے پاکستان کی ترقی کی بھی فکر ہے۔

میں نے حالات پر گہرا غور وخوض کیا ہے اور ان کا جائزہ لیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک طرف رکھ کر اس کا جائزہ معروضی طور پر لیا ہے' میں نے پاکستان کی سلامتی کے لیے بھی سوچا اور سیاسی ہم آہنگی کے لیے بھی۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مسئلے پر صحیح وقت پر فیصلہ کرنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ فیصلے کا یہی وقت ہے' اور اس لمحے فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں دسمبر ۲۰۰۴ء تک اپنی وردی اتار دوں گا اور چیف آف آرمی اسٹاف کے منصب سے دستبردار ہوجاؤں گا۔ اس عرصے میں' میں خود ہی قطعی تاریخ کا فیصلہ کروں گا۔

آخر میں' میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے یہ فیصلہ کرنے میں میری رہنمائی کی۔ میں اس موقع پر پاکستانی قوم کو مبارک باد دیتا ہوں اور میں اپنی طرف سے قوم کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں پاکستان کی ترقی اور خودمختاری پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔

اللہ ہم سب کی حفاظت کرے۔

جس طرح چاہیں ان الفاظ کو پڑھ لیں' ان کا تجزیہ کرلیں' ان کی تعبیر کرلیں' بات بالکل واضح ہے

کہ:

۱- بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرلیا گیا۔

۲- یہ طے ہوگیا کہ ایک عہدہ' یعنی چیف آف اسٹاف کا عہدہ چھوڑ دیا جائے گا۔

۳- اور یہ کام ۳۱ دسمبر تک ہوجائے گا۔

صرف ایک اختیار باقی تھا اور وہ یہ کہ ۳۱ دسمبر سے پہلے اگر اعلان کرنا چاہیں تو جنرل صاحب کرسکتے ہیں۔ یہ کوئی مشروط فیصلہ نہیں تھا کہ جب چاہیں اسے تبدیل کردیں۔

عہدو پیمان کے بارے میں صدر صاحب کی ۲۰ نومبر ۲۰۰۲ء کی تقریر کا ایک اقتباس بھی خود ان کو یاد دہانی کے لیے پیش کرنا ضروری ہے جو انھوں نے قرآن پاک کی سورہ بنی اسرائیل اور سورۂ مائدہ کی عہد کی پابندی کے سلسلے میں دو آیات کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

> حکمرانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ عوام کے اعتماد کا احترام کریں اور اپنے وعدوں کو پورا کریں۔

اگر افراد کو یہ حق دے دیا جائے کہ جب چاہیں اپنے عہدو پیمان سے پھر جائیں تو پھر زندگی کا نظام کیسے چل سکتا ہے اور ایسے قائدین کے قول و فعل پر کون بھروسا کرسکتا ہے۔

○ **ترقی اور استحکام کے لیے باوردی صدر**: اس سلسلے کی تیسری دلیل اور بھی بودی اور سیاسی اعتبار سے رسوا کن ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ملک کے سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کے لیے مضبوط اور طاقت ور صدر کی ضرورت ہے۔ ملک کی صدارت' سیاسی نظام' پارلیمنٹ پر اس سے بڑا الزام اور اتہام نہیں ہوسکتا۔

دستور نے صدر کو اختیارات دیے ہیں اور اس کی قوت کا سرچشمہ دستور اور قانون ہے' بندوق کی نالی نہیں۔ اگر استحکام کے لیے وردی کی ضرورت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دستور نے صدر کو جو اختیارات دیے ہیں اور ان میں وافر اضافہ آٹھویں ترمیم اور سترھویں ترمیم کے ذریعے کیا جا چکا ہے' وہ کافی نہیں ہیں۔ اس طرح پارلیمنٹ جو اصل خودمختار (sovereign) ادارہ ہے وہ اقتدار کا سرچشمہ نہیں بلکہ اقتدار کا اصل سرچشمہ چیف آف اسٹاف کا عہدہ اور فوج ہے۔ یہ پورے سیاسی نظام اور دستوری انتظام کی نفی کے مترادف ہے۔ پہلے ہی پارلیمنٹ اور

وزیراعظم دونوں کی تنزلی اور سبکی ہو چکی ہے اور اختیارات کا خاصا ارتکاز صدر کی ذات میں ہو گیا ہے۔ برا یا بھلا یہ انتظام پھر بھی دیکھنے میں دستوری لگتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کہ سیاسی اور معاشی استحکام اور ترقی کے لیے صدر کا عہدہ اور اختیارات کافی نہیں اور اس کے لیے چیف آف اسٹاف ہونا ضروری ہے، یہ پورے سیاسی انتظام کی نفی کرتا ہے اور خود جنرل صاحب کے پانچ سالہ ''کارناموں'' پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے۔

سیاست دانوں کا وردی جاری رکھنے کی بات کرنا اور پنجاب کی اسمبلی کی شرمناک قرارداد سیاسی خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اپنی آزادی کو خود ہی فروخت کر دے اور اپنے کو غلام بنانے پر آمادگی کا اظہار کرے لیکن قانون کی دنیا میں یہی ایک چیز ہے جس کے بارے میں مکمل اتفاق راے ہے کہ کوئی شخص اپنی آزاد مرضی سے بھی خود اپنے کو فروخت نہیں کر سکتا۔

سیاسی اور دفاعی مضمرات کے ساتھ ان حالات کے کچھ بڑے اہم بین الاقوامی اثرات بھی ہیں۔ اگر کسی ملک کی قیادت عہدو پیمان کے بارے میں ایسی غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کر سکتی ہے تو اس کے عالمی عہدو پیمان کی کیا حیثیت ہوگی۔ پاکستان نے جمہوریت کے احیا کے سلسلے میں پوری دنیا سے ایک عہد کیا ہے۔ دولت مشترکہ میں ہماری واپسی اور یورپی یونین کا پاکستان کو جمہوری ملک تصور کرنا اس شرط سے مشروط تھا کہ صدر چیف آف اسٹاف کا عہدہ چھوڑ دیں گے اور دستوری عمل کو مکمل طور پر بروے کار لانے کا موقع دیا جائے گا۔ امریکا کے مفادات جو کچھ بھی ہوں اور ہمیں علم ہے کہ امریکا کی جمہوریت سے دل چسپی کسی دوغلے پن اور مفاد پرستی پر مبنی ہے، لیکن عالمی برادری میں ہمارا وقار اسی وقت بحال ہو سکتا ہے جب ہم جمہوری سفر کو جاری رکھیں اور اپنے تمام عہدو پیمان پورے کریں ورنہ ہماری اس کمزوری کا اصل فائدہ امریکا کو ہوگا جو پہلے ہی ہمیں بلیک میل کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور صدر جنرل مشرف کو اپنا حلیف بنا کر پاکستان کو اپنی چاکری پر مجبور کر رہا ہے۔ جنرل صاحب نے

بڑے طمطراق سے دعویٰ کیا ہے کہ میں کسی کے دباؤ میں نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۱/۹ کے بعد جس طرح انھوں نے امریکا کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں اور مسلسل اس کے احکامات کی اطاعت کر رہے ہیں، اس نے پاکستان کی آزادی، خودمختاری اور سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ بوب وڈورڈ کی کتاب Bush at War کا مطالعہ کر لیجیے۔ کانڈولیزا رائس کی امریکی کانگرس کے سامنے گواہی کو دیکھ لیجیے، صاف کہتی ہے ہم نے جنرل مشرف کے لیے گاجر اور چھڑی (carrot and stick) کی پالیسی اختیار کی۔ گاجر کم اور چھڑی زیادہ۔ بوب وڈورڈ لکھتا ہے کہ جنرل محمود احمد اور جنرل پرویز مشرف دونوں نے بلاچون و چرا امریکا کے ساتوں مطالبات اس طرح تسلیم کر لیے کہ خود جنرل پاول کو تعجب ہوا اور امریکا کی قیادت اس پسپائی اور سپردگی پر حیرت زدہ ہوگئی۔

Bush at War کے صفحہ ۴۷ پر آرمیٹج کی جنرل محمود سے گفتگو بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کا مطالعہ کر لیجیے جس سے ہر پاکستانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ پھر صفحات ۵۸-۵۹ کے مطالبات اور ان پر آمنا و صدّقنا کی داستان پڑھ لیجیے اور خود امریکی قیادت کے تعجب کا حال پڑھ کر پسینہ پسینہ ہو جایئے۔ بہادری کے سارے دعوے اپنے کمزور عوام ہی کے مقابلے میں ہیں۔ کیا پاکستان، ایران، شمالی کوریا اور لبنان سے بھی کمزور ہے--- لیکن ہماری قیادت نے ہمارے ملکی وقار کو جو چرکے لگائے ہیں وہ اب تاریخ کا حصہ اور ہماری غیرت اور آزادی پر بدنما داغ ہیں۔ سات مطالبات کی بات اب امریکا کے ۱۱/۹ کے سرکاری کمیشن کی رپورٹ میں بھی آگئی ہے۔ (دیکھیے صفحہ ۳۳۱)

ہم یہ ساری باتیں دل پر پتھر رکھ کر رقم کر رہے ہیں لیکن حقائق حقائق ہیں اور ان سے آنکھیں بند کر کے ہم حالات کی اصلاح کی طرف کوئی پیش رفت نہیں کر سکتے۔

جناب شوکت عزیز صاحب اب ملک کے وزیراعظم ہیں اور انھوں نے دستور کی حفاظت کا حلف لیا ہے۔ پارلیمنٹ کے سارے ارکان اس حلف کے پابند ہیں۔ شوکت عزیز صاحب نے ملک میں قومی یک جہتی اور اتفاق رائے پیدا کرنے اور اپوزیشن کو ساتھ لے کر چلنے کی بات بھی کی ہے۔ اب ان کا اور ان کی پارٹی کا امتحان ہے۔ وہ اس ملک کو دستور کے مطابق

اور پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کر کے چلانا چاہتے ہیں یا ملک کے پارلیمانی نظام کو تہ و بالا کرنے' اس پر ''خاکی صدارتی نظام'' مسلط کرنے کے عمل میں آلہ کار بنتے ہیں۔ ہمیں کوئی شبہہ نہیں کہ عوام کی مرضی ان شاء اللہ بالآخر بالاتر قوت ثابت ہوگی اور انا و لا غیری جسے آج کی سیاسی اصطلاح میں "I Syndrom" بھی کہا جا سکتا ہے' کی تاریک رات جلد ختم ہوگی۔ اسے آخرکار ختم ہونا ہے!

البتہ سوال یہ ہے کہ اس تاریخی جدوجہد میں کون کس کیمپ میں ہے اور کون جمہوریت' دستوریت اور قانون کی بالادستی کے تار و پود بکھیرنے اور ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگانے میں معاون رہا ہے' اور کون دستور کے دفاع' قانون کی حکمرانی کے قیام' جمہوریت کے فروغ اور اقتدار کو عوام کی مرضی کے تابع کرنے کی جدوجہد میں مثبت کردار ادا کر رہا ہے؟ تاریخ کا قاضی بڑا بے لاگ فیصلہ دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری جواب دہی اپنے رب کے سامنے ہے جس کی گرفت سے کوئی مفر نہیں۔

آیئے وہ راستہ اختیار کریں جو ملک و قوم کو تباہی سے بچانے اور خیر و فلاح اور جمہوریت اور انصاف کے فروغ کا ذریعہ بنے' اور آخرکار ہمیں اپنے رب کے سامنے سرخرو ہونے کی سعادت بخشے۔

پاک بھارت مذاکرات

مسلم سجاد

دوسری جنگ عظیم کے بعد قوموں کے درمیان تنازعات طے کرنے کے لیے جنگ کے بجاے مذاکرات کے رجحان کو تقویت ملی۔ اقوامِ متحدہ کا کام ہی یہ ٹھیرا کہ کہیں جنگ ہو جائے تو وہ جنگ بندی کے مذاکرات کا ڈول ڈال دے یا ڈلوا دے۔ جب بھارت کشمیر کا مسئلہ اقوامِ متحدہ لے گیا تو جنگ بندی ہوئی اور اس کے بعد مذاکرات کے وعدے ہوتے رہے۔

ایک طویل تاریخ کو مختصر کرتے ہوئے، کشمیر کا مسئلہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا آج اسی جگہ قائم ہے۔ لیکن گذشتہ چند برسوں سے ہماری حکومت کی طرف سے بڑے پُراعتماد اعلانات ہونے لگے کہ مسئلہ حل ہونے ہی والا ہے اور آیندہ سال مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کا سال ہے۔ آگرہ مذاکرات میں تو جیسے مسئلہ حل ہونے ہی والا تھا کہ رکاوٹ پیش آگئی۔ پھر ۱۱/۹ پیش آگیا اور حکومتِ پاکستان نے یوٹرن لیا' افغانستان پر حملے کے لیے امریکا کو کندھے ہی نہیں اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔ اس وقت یہ توقع دلائی گئی کہ جیسے اس 'کارخیر' کے نتیجے میں امریکا بھارت پر کچھ دباؤ ڈال کر کشمیر کا کچھ ایسا تصفیہ کروا دے گا جس سے کچھ اشک شوئی ہو جائے اور حکومت اسے عوام سے قبول کروا سکے۔ اس مقصد کے لیے ہماری طرف سے صبح و شام کسی بھی جگہ کسی بھی وقت مذاکرات کی بھیک مسلسل اور تواتر سے مانگی گئی۔ اس نے قومی عزت و وقار کو جو بٹہ لگایا سو لگایا لیکن ہم مذاکرات کی رٹ لگانے سے باز نہ آئے تاآنکہ واجپائی صاحب سارک کانفرنس میں ہمارے بے حد اصرار پر تشریف لائے اور ایسا معلوم ہوا جیسے کہ ہم نے کوئی معرکہ مار لیا ہے' اور اب جب مذاکرات شروع ہوں گے تو کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

کشمیر کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کے موقف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پاکستان کشمیر کو مرکزی اور بنیادی مسئلہ قرار دیتا ہے کہ باقی تمام مسائل اس کے بعد طے ہونا شروع ہوں گے' جب کہ بھارت کا موقف ہے کہ اعتماد کی بحالی ہو' تو پھر کشمیر کے مسئلے کو دیکھا جائے گا اور اعتماد کی بحالی کے لیے اقدامات کی ایک فہرست اعتماد سازی کے اقدامات کے نام سے پیش کر دی جاتی ہے۔

یہ اس پس منظر میں تھا کہ کشمیر میں جہادی سرگرمیاں جاری تھیں لیکن ۱۱/ ۹ کے بعد جب ہم نے ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ میں امریکا کا ''اتحادی'' بننے کا اعلان کیا تو بھارت نے امریکا کی پشت پناہی سے جہاد کشمیر کو دہشت گردی قرار دلوانے کی کوشش کی۔ ہم زبان سے کچھ بھی کہیں' ہماری حکومت نے کشمیر کے جہاد کو بھی دہشت گردی تسلیم کر لیا ہے۔ تربیتی کیمپ بند کرنے کے وعدے ہی نہیں کیے' بلکہ عملاً بند کروا بھی دیے اور امریکا جانے سے پہلے ۱۸ ستمبر کو واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو میں ہمارے باوردی صدر نے ایک بار پھر اس 'کارنامے' کا اعادہ کیا ہے۔ دراندازی روکنے کی ذمہ داری بھی ہم ہی نے لی اور بڑی حد تک اسے پورا بھی کیا۔ دوسری طرف اعتماد کی بحالی کے لیے ثقافتی طائفوں کا آنا جانا' کرکٹ میچ کے موقع پر خصوصی آمدورفت کی سہولتیں' باہمی تجارت کے لیے راستے کھولنا' تعلیمی و دیگر روابط استوار کرنا شامل ہیں۔ اس ضمن میں پاک بھارت دوستی کی فضا کو بہتر بنانے کے لیے تعلیمی نصاب میں بھی تبدیلیاں کی گئیں خاص طور پر نظریۂ پاکستان کے تصور کو مسخ کرنے اور ایسے تمام مضامین کو نصاب سے نکالنے کی قصداً کوشش کی گئی جس سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات اور دوستی پر زد پڑتی ہو۔ گویا اساس پاکستان کو ہی داؤ پر لگا دیا۔ اس سب پر پیش قدمی بہت خلوص سے جاری ہے۔

خاص طور پر دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے یک طرفہ طور پر اپنی طرف سے جنگ بندی کر دی' گویا تسلیم کر لیا کہ ہم ہی گولہ باری کرتے تھے اور بھارت کو پورا تحفظ فراہم کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ہماری آشیرباد سے بھارت نے کنٹرول لائن کے پار باڑ لگا دی ہے جس کو صرف دراندازی بند کرنے کی تدبیر نہیں بلکہ صحیح طور پر مستقبل کی بین الاقوامی سرحد بنانے کا عندیہ سمجھا جا رہا ہے۔

بھارت سے حال ہی میں ۴ تا ۶ ستمبر دہلی میں وزراے خارجہ کی سطح پر جو مذاکرات ہوئے ہیں' اس میں بھی بھارت کی طرف سے یہ بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ وہ کشمیر پر کسی قسم کی بات چیت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ بات چیت بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ بھٹوسورن سنگھ مذاکرات اس کی مثال ہے۔ ہماری طرف سے ٹائم فریم مانگا جاتا ہے ادھر سے صاف انکار ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب تک دراندازی کا بالکل خاتمہ نہیں ہوجاتا کوئی بات چیت نہیں ہوگی۔ اِدھر امریکا بھی ہم ہی سے کہتا ہے کہ دراندازی کو روکو۔ اسلام آباد آکر ان کے نمایندے بھی ہم پر ہی دباؤ ڈالتے ہیں' جیسے اصل قصوروار ہم ہی ہیں۔

بھارت نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ بھارت ظلم و جبر سے حکومت کر رہا ہے' روزانہ آٹھ دس کشمیریوں کو شہید کر رہا ہے' جیلیں اور عقوبت خانے نوجوانوں سے بھرے ہوئے ہیں' خواتین کی عزتیں پامال کی جارہی ہیں' لیکن ہم کسی موہوم کامیابی کی آس میں بھارت کا مکروہ چہرہ بھی دنیا کو دکھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

اپنے حکمرانوں کی بے بصیرت اور طفلانہ حرکتوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید ملت پاکستان کے اجتماعی گناہوں کی پاداش میں یہ مسلط کیے گئے ہیں۔ خدشہ ہے کہیں حکمران اس ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینے کا سبب نہ بن جائیں۔ کشمیریوں نے جہاد کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا تھا' وہ ہم مذاکرات کی میز پر گنوانے کے لیے بے چین ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بھارت کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ہماری ہرطرح کی شرائط کو ماننے پر آمادگی کے باوجود ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ شاید ہمارے حکمران باعزت قوم کی طرح سوچنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہوگئے ہیں۔

دہشت گردی کی جنگ کے نام پر ہم نے جس طرح اپنا ایمان اور اپنی عزت نیلام کی ہے' اس کے بعد ہم سے اہلِ کشمیر کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم اپنے حکمرانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ باعزت طریقہ اپنائیں۔ بھارت جو کچھ کشمیر میں کر رہا ہے اس کی تصویر ساری دنیا کو دکھائیں' اس کی ناراضی کی پروا نہ کریں۔ دہشت گردی اور جہاد میں تمیز کریں اور جہاد کی ہرطرح سے حوصلہ افزائی کریں۔ جب تک بھارت کشمیر پر کشمیریوں کو ان کا حق دینے پر آمادگی کا

اظہار نہیں کرتا‘ اس وقت تک اس سے ہمارا دوستانہ طرزِعمل کمزوری کی علامت ہے۔

امریکا ساری دنیا کو مذاکرات کے ذریعے مسائل حل کرنے کا سبق پڑھاتا ہے مگر خود پیش بندی کے طور پر حملے کو بھی جائز اور روا سمجھتا ہے۔ یہی سبق اب روس اور آسٹریلیا نے بھی پڑھ لیا ہے‘ اور کوئی وجہ نہیں کہ بھارت جسے بعید نہیں کہ شاید ہم بھی سلامتی کونسل کا ممبر بنانے کے حامی ہو جائیں‘ یہ سبق نہ پڑھ لے اور جن تربیتی کیمپوں کی تصاویر امریکا ہمیں دکھاتا ہے ان کو ختم کرنے کے لیے خود چڑھ دوڑے۔ اس وقت شاید ہماری فوج دشمن کے خلاف صف آرا ہو جائے‘ فی الحال تو اسے دوستوں کے خلاف صف آرا ہونے سے فرصت نہیں۔

قوم کے دردمندوں کو میزان لگانا چاہیے کہ ۱۱/۹ کے بعد جو یوٹرن لیا گیا اس کے نتیجے میں بحیثیت قوم ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا‘ اسی میزان کا ایک باب کشمیر ہے۔ دیکھا جائے کہ ہم اس باب میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ بھارت نے کتنی پیش قدمی کر لی ہے اور ہماری پسپائی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ہم نے کچھ بھی حاصل کیے بغیر بہت کچھ کھو دیا ہے۔ بھارت نے کوئی لچک نہیں دکھائی ہے بلکہ اس کے مؤقف میں سختی آ گئی ہے۔ ادھر ہم ہیں جو نہ صرف لچک پر لچک دکھا رہے ہیں‘ بلکہ مزید کے اشارے اور وعدے بھی کر رہے ہیں۔ سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے جب پی ٹی وی کے تجزیہ نگار اسے شعور کی پختگی قرار دیتے ہیں۔ اب بیک ڈور ڈپلومیسی کا آسرا لیا جا رہا ہے کہ شاید ۲۴ ستمبر کو مشرف من موہن ملاقات میں کوئی بریک تھرو ہو جائے۔ کاش کہ ہمارے حکمران سمجھیں کہ باغیرت قوموں کے معاملات اس طرح نہیں چلائے جاتے!

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (فتح کے بعد) خیبر میں پڑاؤ کیا (خیبر کا آدھا حصہ جنگ اور آدھا حصہ سمجھوتے کے ساتھ فتح ہوا تھا)۔ خیبر کے سردار بڑے منہ زور اور سخت مذہبی قسم کے آدمی تھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! کیا آپؐ کے لیے جائز ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کریں' ہمارے پھلوں کو کھائیں' ہماری عورتوں کو ماریں؟ یہ سوال پیش بندی کے طور پر کیا گیا تھا (واقعہ صرف گدھوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے پکانے کا پیش آیا تھا' باقی کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ صرف اس کے کچھ آثار نظر آئے تھے۔ گدھوں کے گوشت کی حرمت اس کے بعد آگئی۔ چنانچہ پکا ہوا گوشت ضائع کر دیا گیا)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال کا سن کر ناراض ہوئے۔ آپؐ نے فوری طور پر مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے حضرت ابن عوفؓ کو بلایا اور فرمایا: اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور اعلان کرو: جنت میں داخلہ حلال نہیں مگر مومن کے لیے' اور اعلان کرو کہ لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ چنانچہ لوگ نماز کے لیے جمع ہو گئے۔

آپؐ نے نماز پڑھائی۔ پھر کھڑے ہو کر خطاب فرمایا: کیا تم میں سے ایک شخص اپنے تخت پر بیٹھے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ نے نہیں حرام کیا مگر اس چیز کو جسے قرآن میں حرام کیا گیا ہے (گدھے کے گوشت کی حرمت کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے)۔ سنو! میں نے وعظ بھی کیے ہیں

اور احکام بھی دیے ہیں اور بہت سی چیزوں سے روکا ہے۔ وہ بھی قرآنی احکام کے مانند یا اس سے بھی زیادہ تاکید کی حامل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال نہیں کیا کہ اہلِ کتاب کے گھروں میں بلااجازت داخل ہو جاؤ، ان کی عورتوں کو مارو اور ان کے پھلوں کو کھانے کی اجازت نہیں دی، جب کہ وہ اس سمجھوتے کا پاس بھی کریں جو انھوں نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ (ابوداؤد)

ظلم و زیادتی کو روکنے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کرنے چاہییں تاکہ اس کو واقع ہونے سے روکا جاسکے۔ مستعد، فعال اور عدل کے لیے فکرمند قیادت ایسا ہی کرتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنگامی بنیادوں پر صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے لرزہ طاری کر دینے والا خطاب فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ آج کی مہذب دنیا میں لاکھوں انسانوں کو بموں اور میزائلوں کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ بعد میں جب واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ بلاجواز اور غلط اطلاعات کی بنیاد پر تھا تو اس پر صرف اتنا کہہ دیا جاتا ہے کہ ''ہمیں اس پر افسوس ہے!'' کیا یہ انصاف ہے؟

دوسری بات یہ سامنے آئی کہ یہ سمجھنا کہ جو قرآن نے حرام کیا ہے، بس صرف وہی حرام ہے، غلط ہے۔ رسول اکرمؐ کی شارع کی حیثیت ہے اور آپؐ نے بھی احکامات دیے ہیں۔

○

حضرت عبدالرحمٰن بن عجلانؓ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات سے عاجز ہو کہ ابوضمضم کی طرح ہو جاؤ؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ ابوضمضم کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے گزری ہوئی اُمتوں میں سے ایک شخص تھا۔ جب صبح ہوتی تھی تو کہتا: ''اے اللہ! میں نے اپنی عزت کی پامالی اس آدمی کو معاف کر دی ہے جو مجھے گالی دے''۔ (ابوداؤد)

جب کسی کو گالی دی جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر پہلے ہی قدم پر معاف کر دیا جائے تو بنائے فساد ہی نہ پڑے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی ایک شخص کے طریقے کو بطور نمونہ پیش فرمایا۔ ہم میں سے ہر شخص، دل کو اتنا بڑا کر لے کہ صبح ہوتے ہی اس دن کی زیادتیاں پیشگی معاف کر دے تو زندگی امن و سکون کا گہوارہ ہو جائے۔ بدلہ لینے کے جذبے پر قابو پانا اصل بات ہے۔

○

حضرت جابر بن سلیمؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ایک شخصیت تشریف فرما ہیں' لوگ ان کے پاس آتے ہیں' ان کی بات سنتے ہیں' مانتے ہیں اور عملی جامہ پہنانے کے جذبے سے واپس چلے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ معلوم کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا: علیك السلام یارسول اللہ ۔آپؐ نے فرمایا: یوں نہ کہو یہ تو مُردوں کو سلام ہے۔ اس کی بجائے السلام علیك کہو۔ میں نے پوچھا: آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔آپؐ نے فرمایا: میں اس اللہ کا رسول ہوں کہ جب تجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو تم اس کو پکارتے ہو اور وہ تمھاری مصیبت کو دُور کرتا ہے' جب تم پر قحط پڑے تو تم اسے پکارتے ہو تو وہ زمین کو سرسبزی اور شادابی عطا فرماتا ہے' اور اگر تم جنگل و بیاباں میں ہو اور تمھاری اونٹنی گم ہو جائے تو تم اسے پکارتے ہو اور وہ تمھیں اونٹنی لوٹا دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! مجھے نصیحت کیجیے۔آپؐ نے فرمایا: کسی کو گالی نہ دو۔ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد کسی آزاد' کسی غلام' کسی اونٹ اور کسی بکری کو گالی نہ دی۔

یہ عام رواج سا ہے کہ کسی بزرگ سے ملاقات کرتے ہیں تو رخصت ہوتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ: مجھے کوئی نصیحت کریں۔ اس موقع پر سننے والا متوجہ ہوتا ہے اور اس کا امکان ہوتا ہے کہ جو نصیحت کی جائے گی' اس پر عمل کیا جائے گا۔ اس لیے ضرور کوئی مفید بات کہنا چاہیے۔ شخص کے حالات سے واقف ہوں تو اس کی مناسبت سے کوئی کام کی بات یا کوئی عمومی نصیحت کر دی جائے۔ کوئی ایسی نظری بات نہ کہی جائے جو قابلِ عمل نہ ہو۔ مثال کے طور پر آپ کسی دکان دار کو کہہ سکتے ہیں کہ قسمیں نہ کھایا کرو۔ جس طرح رسولؐ اللہ نے محض یہ بات کہی کہ کسی کو گالی نہ دینا۔ یقیناً اس بات کا کوئی پس منظر ہوگا۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں: میری والدہ دین شرک پر قائم تھیں' میں انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے کراہت ہوئی' مجھے دکھ ہوا۔ میں روتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا: یارسول اللہ! میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتا رہتا تھا' وہ انکار کرتی رہتی تھیں۔ آج میں نے انھیں دعوت دی تو

انھوں نے مجھ سے آپؐ کے بارے ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے کراہت آئی۔ آپؐ اللہ سے دعا کیجیے کہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے دے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت عطا فرما''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سن کر میں خوش ہوگیا۔ گھر کی طرف واپس ہوا' قریب پہنچا تو دروازے کو بند پایا' لیکن والدہ نے میرے جوتوں کی آہٹ سن لی۔ انھوں نے مجھے آواز دی' ابوہریرہ' ٹھیرجاؤ! میں نے پانی گرنے کی آواز سنی' سمجھ گیا کہ والدہ غسل کر رہی ہیں۔ والدہ نے غسل کرلیا' کپڑے پہنے اور پھر اس قدر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھیں کہ سر پر چادر نہ لے سکیں' دروازہ کھولتے ہی کہا: ابوہریرہ! اشھد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا عبده ورسوله۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش خبری سنانے کے لیے فوراً آپؐ کی طرف واپس ہوا اور مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ حاضر ہوا تو عرض کیا: یارسول اللہ! خوش خبری قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کرلی ہے۔ ابوہریرہ کی ماں کو اس نے ہدایت دے دی ہے۔ آپؐ نے اللہ کا شکرادا کیا اور کلماتِ خیر سے نوازا۔ میں نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! دعا کیجیے کہ اللہ مجھے اور میری والدہ کو اپنے مومن بندوں کا اور انھیں ہمارا محبوب بنادے۔ رسولؐ اللہ نے دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''اللہ! اپنے پیارے بندے ابوہریرہ اور اس کی ماں کو اپنے مومن بندوں کا اور مومنین کو ان کا محبوب بنادے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جو مومن بھی میرے متعلق سنتا ہے یا مجھے دیکھتا ہے' وہ مجھ سے محبّت کرتا ہے۔ (مسلم)

یہ روایت از دل خیزد بر دل' یعنی دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے' کی بہترین مثال ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی طرح دل میں ایسی آگ سلگ رہی ہو کہ بے قرار اور مضطرب کردے' غم زدہ کردے اور آنکھوں کو اشکبار اور دل کو تڑپا دے تو وہ رنگ لاتی ہے۔ بندے کے بس میں جو کچھ ہو' وہ کر گزرے تو پھر وہ ذات جس کے بس میں سب کچھ ہے' اپنے بندوں کی کوتاہیوں کو بھلا کر ان کو راضی کردیتا ہے۔ ایمان کے لیے تڑپ کے بعد دوسری تڑپ اگر ہے تو وہ ایمان والوں کی محبت اور ان کی محبوبیت۔ ایمان کی توفیق ہو تو وہ ایمان والوں کی محبت کے لیے تڑپا دے گی اس کے حصول کے لیے آہ وزاری ہوگی اور دعائیں ہوں گی اور دوسروں سے کروائی بھی جائیں گی۔ مومنین کے ساتھ کھڑا ہونے پر خوشی ہوگی اور کفار کے ساتھ مل جانا' ناگوار ہوگا۔

اگر ہم اپنا محاسبہ کریں:

ہم شب بیداری اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مناجات کرنے میں کس قدر غافل ہوگئے ہیں۔ ہم میں سے بعض افراد تو شب بیداری کو اس طرح بھول گئے ہیں کہ اس کا خیال اسی وقت آتا ہے جب اس کے متعلق کوئی عبارت ہماری نظر سے گزرتی ہے، قرآن کی آیت ہمارے کان میں پڑتی ہے، یا کوئی واعظ اس کی یاددہانی کراتا ہے۔

گویا کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ناپید ہوگئی ہے۔ ایک خواب ہے جو شکستہ ہوگیا ہے۔

ہم نیک لوگوں کی عبادت کے متعلق بہت کچھ سنتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بدلی کی طرح ہوتا ہے جو برستی ہے اور ضمیر کچھ وقت کے لیے زندہ ہوجاتا ہے لیکن پھر سورج چمکتا ہے تو زمین کچھ دیر بعد خشک ہوجاتی ہے۔ اسی طرح کچھ دیر وعظ ونصیحت سننے کے بعد ہمارا دل پھر لہو ولعب میں مشغول ہوجاتا ہے۔

جب ہم آٹھ گھنٹے یا اس سے زیادہ سوتے ہیں تو گویا ہم اپنے آپ کو قید کرنے کا فیصلہ سنا دیتے ہیں اور قیامِ لیل اور صبح کے ستاروں سے اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں۔

کیا ہمارا دل قرآن پاک کی تلاوت اور اپنے مہربان رب سے مناجات کرنے سے بھر گیا ہے؟

ہمیں دنیا کی چمک دمک، کمزور ارادوں اور گھاٹے کی تجارت نے مشغول کر رکھا ہے۔ اگر ہمیں شعور اور یقین ہو، اگر ہم فکروتدبر کریں اور اگر ہم اپنے آپ کو پابند کریں اور محاسبہ کریں تو کام بہت آسان ہوجائے گا۔

اگر اللہ تعالیٰ ہم میں سے کسی کو ایک گھڑی کے لیے قیامِ لیل کی توفیق دے تو اسے ایمان کی مٹھاس اور مناجات کے ذائقے کا احساس ہوجائے گا۔

کیا ہم قیامِ لیل کی کوشش کرتے ہیں؟ اس کے لیے اسباب فراہم کرتے ہیں؟

(خیرخواہ)

49

رائے کی بنیادیں

ہر انسان کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کی طرح نہیں سوچتا ہے۔ کچھ انسانوں کی سوچ پر یہ غلاف بھی چڑھا ہوتا ہے کہ دوسرے اس جیسا سوچ ہی نہیں سکتے۔ سوچ کے عمل کا خفیہ انداز میں ذہن کے اندر پروان چڑھنا، محفوظ رہنا اسی طرح کی سوچ کو تقویت دیتا ہے۔ کوئی انسان اپنی صحت، رنگ یا خوب صورتی کے بارے میں اس طرح کے مغالطے کا شکار نہیں ہوسکتا۔ درج ذیل نوعیت کی غلطیاں بالعموم صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش میں رکاوٹ ڈالتی ہیں اور ہر ایک اس کا ارتکاب کسی نہ کسی درجے میں کرتا ہے:

۱- **اطلاق میں مبالغہ:** مختلف معاملات کے مخصوص پہلوؤں کو نظرانداز کر کے کسی ایک عمل کے نتیجے کا وسیع پیمانے پر اطلاق کرنا انسانی ذہن کی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔

۲- **ماضی کو مستقبل کا پیش خیمہ سمجھنا:** تسلسل انسانی زندگی کو وقت کے دھارے پر قائم رکھتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مستقبل میں وہی کچھ ہوگا جس کے لیے ماضی میں بیج بویا گیا ہے۔

۳- **بات کو انتہا پر لے جانا:** انسانی رائے جذبات کے ساتھ بھی وابستہ ہوتی ہے اور جذبات اکثر سوچ کو انتہائی درجے پر ڈھلکا کر حقائق سے دُور کر دیتے ہیں۔

۴- **دلیل کے بجاے فرد کو تولنا:** کیا کہا گیا ہے کے بجاے کون کہہ رہا ہے پر توجہ چلی جائے تو جواباً دلیل سمجھنے کے بجاے فرد کو رد کرنے یا قبول کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

۵- **یہ بات ویسی ہی ہے:** ماضی کے تجربات نئے واقعات کو پرانے سانچوں میں ہی ذہن کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان جلد ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ یہ فرد یا بات ویسی ہی ہے جیسا کہ پہلے کسی کی بات سُنی یا فرد سے سابقہ پیش آیا۔

۶- **سبب اور تعلق کو گم کر دینا:** کیوں کے جواب میں ہماری نظریں اکثر بظاہر تعلقات پر ٹھیر جاتی ہیں۔ افراد/واقعات کا ظاہری تعلق، ان کی ترتیب اصل عوامل تک نہیں پہنچنے دیتی۔

۷- **سوچ کو کھونٹے سے لٹکا دینا:** لوگ اپنی سوچ کو اپنی گرفت میں لینے کے بجاے کسی دوسرے فرد یا قوم کی سوچ سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔

۸- **پسندیدگی:** جب مقصد مخاطب کی پسندیدگی اور قبولیت ہو، تو سوچ کا عمل خوشامد کے لیے الفاظ کی تلاش تک محدود ہو جاتا ہے۔

۹- **ظاھر ھے:** ظاہر ہے کے ساتھ جو جملے شروع ہوتے ہیں ان میں بہت کچھ ظاہر ہوتا نظر نہیں آتا۔

۱۰- **خلط ملط کرنا:** اگر سفید ہے تو کالا نہیں ہوگا، لیکن لوگ سب کچھ خلط ملط کر لیتے ہیں۔

سنابل العلم

اقامت دین کے قرآنی اصول

صدرالدین اصلاحیؒ

قرآن حکیم کو غور سے پڑھیے تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتے ہیں جن کے مطابق اقامتِ دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکز یہی اقامت دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول و ذرائع کی شرح و تفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لیے کوئی ضروری تدابیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو اس کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ تھا۔ اس لیے اس کے اصول و طریق کار کو اس نے جہاں سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انھیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے تاکہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان کی پوری تصویر بیک نظر بھی دیکھی جا سکے۔ اس طرح کے ''جوامع الکلم'' میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیات یہ ہیں:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ ...... وَلْتَكُنْ

مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ‌ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۲-۱۰۵)

اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم ''مسلم'' ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دل باہم جوڑ دیے۔ اور اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے...... اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے' ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں' اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی ابتدائی زندگی' یعنی ۲ھ میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اُمت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ عین اس زمانے میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظامِ مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ جس میں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتا دیے گئے ہیں بلکہ یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے' نیز یہ بات بھی کہ اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کن تدریجی مرحلوں سے گزرتی ہوئی اپنی غایت مقصود تک پہنچا کرتی ہے۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو وہ تین اجزا یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا:

۱- تقویٰ کا التزام ۲- مضبوط و منظم اجتماعیت ۳- امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

یہی تین نکات ہیں جو اقامت دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔

تقویٰ کا التزام

اقامت دین کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی ''شرط اول قدم'' کہنا چاہیے وہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ---کے فرمانِ خداوندی میں مذکور ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو ''ایمان والا'' سمجھتا ہو' اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو' اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کا ''تقویٰ'' اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لمحے ایک ''مسلم'' بن کر زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے۔ اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے اور اس کی کسی نہی کے کر گزرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح ''مسلم'' کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں' یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکامِ خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضا کارانہ جھکا دی ہو۔

اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیشِ نظر اقامت دین کے پروگرام کا پہلا جز' یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اُوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے۔ تعظیم و تذلل اور سرفگندی کے تمام جذبات اسی کی رضاجوئی کے لیے وقف کر دے۔ تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں' اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کے باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تو لیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضاطلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے' خواہ کتنی ہی مخالفتیں' مصیبتیں' ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمایشی منزلیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان اور تقویٰ

خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرفِ قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۵۵)

ہم تم کو (یعنی تمھارے ادعاے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمھارے مال اور جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعے ضرور آزمائیں گے۔ اور اے نبیؐ ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنا دو جو (ان خطرات و نقصانات کو) صبروضبط کے ساتھ برداشت کرلیں۔ الخ

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (العنکبوت ۲۹:۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا۔ حالانکہ (یہ پرکھنا) ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہٰذا (تمھیں بھی) اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لیے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجاے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ یہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہوسکتا۔ جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے اور نہ وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے جو اس آزمایش کی ہمت نہ رکھتا ہو' اپنے ایمان و اسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی' گروہی اور طبقاتی' قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے' اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام' اور اس کی شکل وصورت میں تقویٰ تو ہوسکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائرانِ قدس کا آشیانہ نہیں ہوسکتا۔ غرض اہلِ ایمان کی آزمایش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے۔ اور اسی سنت کو پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام اور ارتقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی

چٹانوں سے بھر رکھا ہے اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ --- کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

منظم اجتماعیت

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اِن لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ تمام اہلِ ایمان، جو احکام الٰہی و حدودِ خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل اور اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظّم جماعت بن جائیں۔ اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضا کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلّق، نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو، نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد بلکہ صرف ''اللہ کی رسی''، یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد ہو جو ہر مسلمان نے کر رکھا ہے۔ وہ قرآن ہو جس کی پیروی ہی کسی شخص کو مومن بناتی ہے۔ وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت ہی کے لیے اُمت مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے۔ غرض جس طرح ملّت کا منظّم اور متحد رہنا ایک ضروری چیز ہے، اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم و اتحاد کا شیرازہ صرف یہ ''حبل اللہ'' ہی ہو، بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی۔ اتنی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہوسکتی ہیں جن میں اتحاد و تنظیم ملت سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذوری اور بری قرار دیا جائے گا۔ مگر جو چیز اس اتحاد و تنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی باز پرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہوسکے گا۔ اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لیے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں، بلکہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے اور اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباعِ حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا نکتہ، یعنی جماعتی اتحاد، اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور بے تعلق شے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلبہ سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبّت رکھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خود بخود کھنچ اٹھنے سے رک نہیں سکتا--- اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے، کسی صاحبِ علم کو اہل علم و فضل سے، کسی رنگین مزاج کو اہلِ نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب اور صاحبِ علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہٗ جنسیت کہا جاتا ہے۔ اصولاً اس جاذبہٗ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہیے، اور وہ کرتا بھی ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو، ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے جو اسی کی طرح اتباعِ حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ اس کے بخلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ اور بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشانِ امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے پیرووں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔

قرآن کی نگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس چیز کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بعض ہدایات پر بھی نظر ڈالی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (توبہ ۹:۲۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ۔ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچّا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا خواہ نسلی اور قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہو اسی طرح وہ فساق و فجار سے قلبی رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا' خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جیسا کہ اسی ضمن کی ایک اور آیت صراحت کرتی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (مجادلہ ۵۸:۲۲)

تم کسی ایسے گروہ کو' جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو' ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں' خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر جوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر ایمان کا یہ منفی اثر وعمل اس کے مثبت اثر وعمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہلِ ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو اور زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علم بردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں' اللہ کا دین اپنے پیروؤں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار و اختلاف کو وہ انتہائی

مذموم ٹھیراتا ہے اور دین حق کے مزاج کے اسے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرت ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بُت پرستی میں مبتلا ہوجاتے دیکھا مگر انھیں صرف سمجھانے بجھانے ہی پر اکتفا کیا اور ان کے خلاف کوئی فوری قدم اٹھانے سے محض اس لیے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندا نہ ہوجائے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کی پہاڑی سے واپس آ کر ان سے اس سلسلے میں سختی سے بازپرس کی تو انھوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ: خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ ''میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی''۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اُوپر دین حق کا قائم کرلینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس ''خیر اور معروف'' کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس ''منکر'' کو اپنے مقدور بھر مٹا ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشے میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامت دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد اُمت کا منظم اتحاد پہلی دفعہ انفرادی صلاح وتقویٰ) کا لازمی تقاضا ہے' اسی طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے نہ کہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس سے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو۔ یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے ایمان اور تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے بآسانی واضح ہوجاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم' کوئی محبت بھری تعظیم محبوب کی مرضیات کے

بارے میں کیا چاہے گی؟ صرف یہ کہ گرد و پیش انھی کی کارفرمائی ہو۔ ورنہ اس دل کو سوزِ محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہرگز بیٹھنے نہیں دے سکتی۔ جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور کھٹکنے کے لیے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرلے۔ لہٰذا اقامتِ دین کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا' اگر پیروانِ اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو۔ اور اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا حکم تشنۂ تعمیل ہی رہ جائے گا۔ اگر اہلِ ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکامِ الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جارہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے' اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت' محبت اور خیرخواہی کا پہلو۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہوگا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہرگز ادا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے۔ اس مخلوق سے جسے اس کے رسول نے اس کی ''عیال'' کہا ہے (اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی نشانی ٹھیرایا ہے (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ- مسلم) نوعِ انسانی کے ساتھ بہی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں مگر اس سے بڑی اس کی اور کوئی بہی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے' اور آخرت بھی۔

اس لیے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو ''منکرات'' سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا بلکہ اپنے اس جذبۂ خیرخواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے' ننگوں کو کپڑے پہنائے'

اور کمزوروں اور بیکسوں کی مدد کرے، اسی طرح، مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وہ اس بات کے لیے بھی بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگانِ خدا کو اس خزانۂ سعادت کی کنجیاں مہیا کردے جس کے پالینے کے بعد پھر کبھی وہ نہ بھوکے ہوں گے نہ ننگے (اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی) نہ انھیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ لاحق ہوگا، نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ)۔ اس کی ایمانی فکر ونظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیرخواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیرخواہیاں بالکل ہیچ ہیں۔ اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز ادا نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہونا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان، اسلام اور تقویٰ سے امر بالمعروف کے یہ دو داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی اور مصلحتی تعلق بھی ہے جسے ہم دعوت اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں، یعنی امر بالمعروف اسلام و ایمان کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے، اور وہ یہ کہ دعوتِ اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجالا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہوسکتا ہے۔ (انتخاب: فریضۂ اقامتِ دین، ص ۱۶۷-۱۸۲)

عوام الناس اور اہلِ علم کے لیے عظیم تحفہ

احادیث کا عظیم انسائیکلوپیڈیا

معین القاری شرح صحیح البخاری

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا معین الدین خٹک
(سابق شیخ الحدیث جامعہ عربیہ)

مرتب: حضرت مولانا حافظ محمد عارف حفظہ اللہ
(نائب شیخ الحدیث جامعہ عربیہ)

چند اہم خصوصیات

- صحیح بخاری کا مکمل متن، اعراب کے ساتھ
- متن کا مکمل ترجمہ
- راویوں کے مختصر حالات زندگی
- تخریج اور حواشی سے آراستہ
- صحیح بخاری کے مشکل مقامات کی آسان اور تسلّی بخش شرح
- اُردو زبان میں صحیح بخاری کی مکمل، مفصل، مدلّل اور سب سے بڑی شرح

''معین القاری کو عصرِ حاضر میں صحیح بخاری کی تقاریر اور شروح میں وہی مقام حاصل ہے جو قرآنِ پاک کی (اُردو) تفاسیر میں تفہیم القرآن کو حاصل ہے''۔ مولانا عبدالمالک

''ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ: شستہ و شگفتہ اُردو زبان میں محققانہ بلند پایہ شرح معین القاری، اساتذۂ علوم نبوت و شائقین دورۂ حدیث کے لیے ایک بیش بہا علمی ہدیہ ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ''۔ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ المدنی

زیرِ نگرانی: مولانا حافظ عطاء الرحمٰن مدنی، مہتمم جامعہ عربیہ گوجرانوالہ

تاریخ ابن خلدون کا الفیصل ایڈیشن

علامہ عبدالرحمن ابن خلدون نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا اور مختلف علوم و فنون سے متعلق ان کی چھوٹی چھوٹی کتب طویل مدت تک مقبول رہیں لیکن ان کی شہرت ان کے شاہکار یعنی تاریخ عالم اور خصوصاً اس کے پہلے حصہ یعنی ہے جس کو عام طور پر مقدمہ ابن خلدون کہا جاتا ہے۔

اس کی تاریخ کا پورا نام "کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرهم من ذوی السلطان الاکبر" ہے لیکن عام طور پر تاریخ ابن خلدون کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو انہوں نے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

"مقدمہ" تاریخ، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے معاشرتی علوم کے مسائل اور مباحث پر ایک کلاسیکی تحریر ہے جس کے تراجم ترکی، فرانسیسی، انگریزی، بنگالی اور اردو کے علاوہ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ "تاریخ ابن خلدون" اردو ترجمے کے تیرہ حصے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

تاریخ الانبیاء (قبل از اسلام) جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک کے حالات درج ہیں۔

☆ حصہ اول میں رسول ﷺ اور خلفائے رسول ﷺ تک کے حالات۔

☆ حصہ دوم میں خلافت معاویہ تا آل مروان تک کے حالات۔

☆ حصہ سوم چہارم میں خلافت عباسیہ تک کے حالات۔

☆ حصہ پنجم میں امیران اندلس اور خلفائے مصر کے حالات۔

☆ حصہ ششم میں غزنوی اور غوری سلاطین کے حالات۔

☆ حصہ ہفتم میں سلجوقی، خوارزم شاہی سلاطین اور فتنہ تاتار کے حالات۔

☆ حصہ ہشتم میں زنگی اور خاندان صلاح الدین ایوبی کے سلاطین اور تاتاریوں کے زوال کے حالات۔

☆ حصہ نہم میں سلاطین مماليک بحریہ مصر کی مفصل تاریخ

☆ حصہ دہم میں مصر و شام میں ممالیک کی سلطنت کے خاتمے سے لے کر ترکی میں آل عثمان کی سلطنت کے آغاز تک کے حالات۔

☆ حصہ یازدہم میں شمالی افریقہ میں بربر قبائل اور ان کے حکمرانوں کے حالات۔

☆ حصہ دوازدہم میں 350ھ سے 800ھ ہجری کے دوران میں عرب میں پائے جانے والے قبائل اور ان کی حکومتوں کے حالات

قیمت =/2500 روپے مکمل 8 جلد
رعایتی قیمت =/1500

تاریخ طبری کا الفیصل ایڈیشن

مورخ اسلام علامہ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (839ء - 923ء) کی یہ وہ شہرہ آفاق کتاب ہے جو ایک ہزار سال سے زائد عرصے سے مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلا رہی ہے۔ یہ مسلمانوں ہی کی نہیں پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ اسی لئے اسے "تاریخ الرسل والملوک" کے علاوہ "تاریخ الامم والملوک" بھی کہا جاتا ہے یعنی مختلف اقوام و سلاطین کی تاریخ، لیکن عرف عام میں یہ "تاریخ طبری" کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ طبری نے اس تاریخ عالم کے لئے ضروری مواد تحریرات اور زبانی روایات سے جمع کیا تھا جن کی فراہمی کے لئے انہیں اسلامی دنیا کے علمی مراکز میں اپنی طویل سیاحت میں خاصے مواقع ملے۔

یہ عظیم الشان کتاب زمانے کے تھپیڑوں سے بچ گئی۔

اس میں لغت، ادب، سیرت، تاریخ، احادیث، تاریخ خلفائے اسلام، تاریخ تفسیر وحدیث وغیرہ متفرق موضوعات جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کتابوں کے اقتباسات بھی محفوظ ہو گئے ہیں جنہیں زمانے نے فنا کر دیا ہے۔ اردو کا یہ ایڈیشن سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں کائنات کی تخلیق سے لے کر آنحضور ﷺ کی ولادت تک تمام حالات و واقعات سابقہ انبیائے کرام کے احوال پر مشتمل ہے۔ جلد دوم میں سرور عالم ﷺ کی حیات طیبہ سے لے کر حضرت عمر فاروق تک کے حالات مذکور ہیں۔ جلد سوم خلافت حضرت عمر فاروق سے حضرت علی تک، جلد چہارم حضرت حسن تا خلیفہ سلیمان بن مالک، جلد پنجم حضرت عمر بن عبدالعزیز تا خلیفہ الہادی، جلد ششم خلیفہ ہارون الرشید تا واثق باللہ، جلد ہفتم خلیفہ المتوکل علی اللہ تا المقتدر باللہ کے مفصل حالات پر مشتمل ہے نیز اس میں تاریخ طبری کا مکمل اشاریہ بھی شامل ہے غرضیکہ کائنات سے 302 ہجری 932ء تک کے حالات پوری تفصیل اور جامعیت سے "تاریخ طبری" میں آ گئے ہیں۔

قیمت =/2655 روپے مکمل 7 جلد
رعایتی قیمت =/1600

منی آرڈر کے ذریعے منگوانے والوں کو 40% فیصد خصوصی رعایت دی جائیگی اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

الفیصل

ناشران و تاجران کتب

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
7230777 -7231387

حقیقتِ سجدہ

علی عمر بادحدح

ترجمہ: خدا بخش کلیار

سجدے کے بارے جب انسان غور کرتا ہے تو پوری کائنات اپنی تواضع' انکساری اور نیاز مندی کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نظر آتی ہے۔اس کی ہیئت اور اس کی خودسپردگی اللہ کے حکم کے موافق ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم جاری وساری ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَه' مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ (الحج ۲۲:۱۸)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہے وہ سب جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے' سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔

پس غور کرو کہ پوری کائنات کی کوئی شے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے سے سرتابی کرنے والی نہیں ہے سوائے اس انسان کے کہ اس کی ایک نوع سجدے کرنے والی اور ایک اس سے انکار کرنے والی اور باقی کائنات سے ہٹ کر سجدہ کرنے سے سرتابی کرنے والی ہے۔مگر وہ انسان جو اللہ کا نافرمان اور ناشکرا ہے وہ پوری کائنات میں مختلف اور منفرد ہوتا ہے اور اس کی یہ انفرادیت اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بُعد اور تکبر ہے۔

لٰہذا بندے کو غور کرنا چاہیے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتا ہے تو وہ اللہ کی تسبیح و تحمید بیان کرنے والی اور اس کے آگے سجدہ ریز اس کائنات کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورہ یٰسٓ میں فرمایا: وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ (۳۶:۳۸) ''اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے''۔ اس آیت کے معنی میں ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ غروب کے وقت اور اپنے ہر غروب میں آفتاب اللہ تعالیٰ کے عرش کے آگے سجدہ کرتا ہے، اور اس کی تائید حضرت ابوذرؓ کی روایت کی ہوئی بخاری کی حدیث کرتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سجدہ کیسے ہوتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ سجدہ زبان حال سے بھی ہے اور زبان قال سے بھی، یعنی علامتاً بھی اور فعلاً بھی۔ اور اس میں کوئی تعجب ہے نہ تحیّر، کیونکہ جو سجدہ بھی اللہ تعالیٰ کو کیا جاتا ہے وہ اس کی ہیئت کو جانتا ہے، جب کہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ (الرحمٰن ۵۵:۶) ''اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں''۔ اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ سرتابی کرنے اور نافرمانوں کو اپنی ہدایت کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ان پر حجت قائم فرماتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ یَسۡجُدُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّکَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ (الرعد ۱۳:۱۵) ''وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں''۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اختیار سے سجدہ کرنے سے پہلوتہی کرنے والا شخص بھی اپنے سائے کے ساتھ اللہ کی قدرت کے سامنے اپنی خلقت اور اپنی جبلت کے تحت بے اختیار اللہ کی جناب میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ گویا پوری کی پوری کائنات اللہ کے آگے سجدہ ریز ہے۔ چنانچہ دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان بھی اپنے دل اور ہیئت کے ساتھ سجدہ کرنے والا ہو۔

عظمتِ سجدہ

یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان جب سجدے کے بارے میں غور کرتا ہے تو وہ اسے ایک

نعمت عظمہ پاتا ہے۔ اس پر مستزاد آیات قرآنی' احادیث نبویؐ اور ارشادت اسلاف ہیں۔ سجدے کی یہی وہ اہمیت ہے جو اسے تدبر اور سنجیدگی سے غور وفکر کی دعوت دیتی ہے کہ وہ اس کی حقیقت کو پانے کی کوشش کرے' نیز اس کا ایمانی وقلبی فہم کتنا ضروری ہے اور اس کی ادایگی پر عمل کرنے کا کیا حکم ہے؟

سعید بن جبیرؒ، جب مسروقؒ سے ملے تو انھوں نے ان سے کہا: ''اے ابوسعید! اپنے چہروں کو خاک آلود کرنے (سجدے) کے سوا کسی چیز سے ہمیں رغبت نہیں ہونی چاہیے''۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ان کی سب سے بڑی خواہش اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز ہونے' اور اگر ان کے لیے کوئی حلاوت ولذت تھی تو وہ اس کی جناب میں عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی جبینوں کو خاک آلود کرنے میں تھی۔

مسروق ؒ نے غایت دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: ''واقعتاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے سوا کوئی ایسی چیز ہے جس کی اس دنیا میں فکر کی جائے'' (نزھة الفضلاء تھذیب سیر اعلام النبلاء)۔ اسلاف امت کی یہ گفتگو واضح کرتی ہے کہ سجدہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے۔ سجدہ محض انسانی اعضا کی حرکت اور زبانی دہرائے جانے والے بے اثر کلمات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ جسم وروح پر اثر انداز ہونے والے اس عمل کا نام ہے جس کی تکمیل حضوری قلب' عجز وانکسار اور عقل وشعور کے گہرے ادراک وفہم کے ساتھ ہوتی ہے۔ لہٰذا سجدے کا مسئلہ بہت وسیع اور عمیق ہے اور ہمارے لیے اس کا بطریق احسن فہم ناگزیر ہے۔

صحیح بخاری میں وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم' جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' ابن مریمؑ تمھارے درمیان حاکم عادل بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جنگ کا خاتمہ کریں گے اور مال پانی کی طرح بہے گا حتیٰ کہ اسے کوئی قبول نہ کرے گا۔ (اس وقت) ایک سجدہ دنیا ومافیہا سے بہتر ہوگا''۔ (کتاب احادیث الانبیاء)

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث پر یہ تبصرہ کیا ہے: ''مال کی کثرت، برکات کے نزول، خیرات کی بارش، عدل گستری اور ظلم کے فقدان کی وجہ سے ہوگی۔ اس وقت زمین اپنے خزانے اگل

دے گی، لوگوں میں قرب قیامت کے احساس سے مال کے حصول کی رغبت گھٹ جائے گی''۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: یعنی لوگ اس وقت اللہ کا قرب عبادت کے ساتھ حاصل کریں گے نہ کہ مال کے صدقے کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ دنیا سے اپنی نظریں ہٹا لیں گے اور انھیں ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے محبوب تر ہوگا۔ پھر قرطبیؒ کا قول نقل کیا ہے: ''حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت نماز صدقے سے افضل ہوگی' اس لیے کہ اس وقت مال کی کثرت ہوگی حتیٰ کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا''۔ (فتح الباری ۶/ ۵۶۶)' یعنی اس وقت ذرائع تقرب انفاق و صدقات نہ ہوں گے کہ انسان ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے بلکہ اس وقت اللہ کے حضور میں سجدہ عظیم عبادت ہوگی اور کوئی دیگر عبادت اس کے برابر نہ ہوگی' حالانکہ حدیث کی رو سے صدقے سے اللہ تعالیٰ کا غضب ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور آدمی بری موت سے بچتا ہے (سنن ترمذی کتاب الزکوٰۃ)۔ چنانچہ جب یہ صدقہ منقطع ہو جائے گا تو تقرب الٰہی کا کوئی ذریعہ سجدے کے سوا باقی نہ رہے گا۔

اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ سجدہ اپنی حقیقت میں عظیم تر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن مسلمان دیگر امور میں مشغولیت کے باعث اسے بھول جاتا ہے اور دنیا میں دل چسپی اسے آخرت بھلا دیتی ہے۔ اسی طرح سجدہ دوسرے اعمال' اگرچہ وہ نیکی کے اعمال ہوں' کے مقابلے میں بھی عظیم تر ہے۔ اگر کسی مسلمان کو صدقہ اور محتاج کی اعانت جیسی دیگر عبادات کی استطاعت نہ ہو تو سجدے کا حصہ نفلی عبادات کی نسبت سے اپنی اہمیت و اولیت کی وجہ سے زیادہ بڑا ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن الدوسریؒ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس ارشاد: یٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (اٰل عمرٰن ۳:۴۳) ''اے مریم' اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ' اس کے آگے سربسجود ہو' اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا'' کی توضیح سجدے کی عظمت کے زمرے میں کی ہے۔ انھوں نے کہا: اس قول کی بنیاد پر کہ 'القنوت' کے معنی عبادت کے ہیں' ملائکہ حضرت مریمؑ کو اولاً ہر نوع کی عبادت پر مداومت کی عمومی

وصیّت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ملائکہ نے انھیں عبادات میں سے افضل واشرف عبادت' یعنی نماز کی ہدایت کی اور اس کی شکلوں میں سے رکوع وسجود کو ان دونوں کے شرف اور اہمیّت کی بنا پر مخصوص کیا' پھر سجدے کو رکوع پر مقدم کیا۔ اس لیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ارکان نماز میں سے افضل رکن سجدہ ہے (صفوۃ الاثار ۱۲۴/۴)۔ لہٰذا جب اس معنی کے ساتھ آیت کریمہ میں سجدے کی عظمت انتہائی حد تک ثابت ہوتی ہے' تب وہ مخصوص ترین عبادت ہے اور نماز جو جملہ عبادات پر مقدم ہے' سجدہ اس میں مقدم و معظم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سجدے کی یہ فضیلت اس کے عظیم مرتبے کی دلیل ہے۔

فیض القدیر میں المناویؒ کہتے ہیں: ''یہ اس لیے کہ بندہ سجدے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں بہ تمام وکمال عجز وانکساری کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنی پستی اور اپنی انتہائی احتیاج کو جان لیتا ہے تو اسے یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کا رب عظیم اپنے ارادے کو نافذ کرنے پر غالب ہے' اور صاحب کبریا وجبروت ہے۔ اس احساس کے ساتھ سجدے کا قبول کیا جانا متوقع ہے''۔ (فیض القدیر ۲/۶۸' رقم الحدیث: ۱۳۴۸)

ہر عبادت کا حاصل یہ ہے کہ انسان مقام عبودیت کو پالے' اپنی ذات کی حقیقت کو جان لے' اللہ تعالیٰ کی عظمت کو سمجھ لے اور باور کر لے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں فقیر ہے۔ وہ اپنے نقص کو حق تعالیٰ کے کمال مطلق کے سامنے رکھے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''عاجزی اختیار کی جاتی ہے تا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی کمالِ قوت کا نظارہ کیا جائے' اور اس کے حضور میں اپنے فقر کو پیش کیا جائے تا کہ اس کے کمال بے نیازی کو دیکھنا ملے' اور اس کی جناب میں ضعف کا اظہار کیا جائے تا کہ اس کی قوت کا کمال نظر آئے۔ چنانچہ جب سجدہ بندے کی پستی اور رب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے تو بندے کی طرف سے اپنے رب اور مولیٰ کے حضور میں اپنے فقر اور احتیاج کا اظہار بندے کے لیے بڑی اہمیّت کا حامل ہے۔

سجدے میں قرب کا مقام

سجدہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا ایک انداز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

فرمایا: كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق ۹۶:۱۹) ''ہرگز نہیں، اس (نماز سے منع کرنے والے) کی بات نہ مانو، اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو''۔ اس آیت کریمہ میں غور کرو، وہ اپنے اندر قلیل اور مختصر الفاظ کے باوجود حیات دنیا کی حقیقت اور انسان کے حوالے سے روح بندگی کی طرف واضح اشارہ لیے ہوئے ہے، جب کہ یہ آیت اس شخص کے ذکر کے بعد آرہی ہے جو اہلِ ایمان کو اللہ کی بندگی سے روکتا ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (العلق ۹۶:۹-۱۰) ''تم نے دیکھا اس شخص کو جو بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو؟''۔ وہ حق و باطل کی کش مکش اور اہل باطل کا اہل خیر پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کا اظہار ہے۔ اس مرحلے پر فیصلہ کن حکم صادر ہوتا ہے كَلَّا لَا تُطِعْهُ، یعنی عبادت کی مداومت اور اس کی کثرت سے روکنے والے کی بات نہ مانیے، اس کی پیروی نہ کیجیے، جہاں کہیں نماز پڑھنا چاہیں، پڑھیے، اللہ تعالیٰ تمھارا حافظ و ناصر ہے۔ وہ تمھیں لوگوں سے بچائے گا۔

اس آیت میں دشمنی و ایذا کے زبردست طوفان کے سامنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت حاصل کرنے کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے سجدے کے ذریعے عبادت و استعانت کے ساتھ مربوط ہونا اور اس پر جمے رہنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ ۲:۱۵۳) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو''۔ اس آیت میں سجدے کو اس سرکشی اور باطل سے مدافعت اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر صبر و ثبات کا ایک وصف بنا دیا گیا ہے۔

امام مسلمؒ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہو، لہٰذا (سجدے میں) خوب دعا کرو۔ اور نبی کریمؐ کی اس ہدایت پر بھی غور کرو جس میں آپؐ نے سجدے میں کیے جانے والے ذکر کی تعلیم دی ہے، ایسے موقع پر جب کہ آدمی کی پیشانی خاک آلود ہوتی ہے اور وہ پورے کا پورا، روح و جسم کے ساتھ اللہ کے حضور میں جھکا ہوتا ہے، ایسی حالت میں وہ کہتا ہے: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔ جب وہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہہ رہا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو اللہ کے قرب میں محسوس کرتا ہے۔ اور یہ سجدے کی تفہیم کا

بنیادی جزو ہے جو بندے کے عجز و انکسار اور رب کی عظمت اور بندے کا اپنے رب کے حضور قرب کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

سوال یہ کہ ایسا کیوں ہے کہ سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے؟

سجدے سے قربِ الٰہی کا حصول

اس سوال کے جواب کے لیے ہم کچھ اسباب کا بیان کریں گے کہ اللہ کے قرب کے لیے سجدہ کیوں مختص ہے؟ بعض اسباب کی طرف تو نصوص رہنمائی کرتی ہیں اور بعض علامات سجدے کی صورت سے اخذ کردہ ہیں:

○ **تواضع و انکساری کی بلیغ ترین صورت:** یہ کہ سجدہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں عاجزی و فروتنی کی بلیغ ترین صورت ہے۔ انسان نہ تو بندہ کہلا سکتا ہے اور نہ انسان اس انکساری و فروتنی اور بندگی کے بغیر بندے بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جناب میں عاجزی و پستی سے ہی انسان اللہ کے حقیقی بندے بن سکتے ہیں۔ ایسی ہی صورت میں انسان وصف عبودیت کا مستحق ٹھیر سکتا ہے۔ لیکن بندگی کے مراتب ہیں۔ جس قدر عجز و انکسار ہوگا' اسی نسبت سے انسان میں وصف عبودیت کی اہلیت ہوگی اور پھر ہی وہ بندہ کہلا سکے گا۔ اور جس قدر وہ عاجزی اختیار کرے گا اور عاجزی کی صورت جس قدر عظیم و کبیر ہوگی' اسی قدر اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کی روح متحقق ہوگی۔

جب ہم نے یہ جان لیا کہ حیات دنیا میں صاحب ایمان انسان کے لیے اللہ کی بندگی بلند ترین درجہ ہے تو ہمارے لیے تقرب الٰہی کے لیے سجدے کے مختص ہونے کا راز آشکارا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور کرو سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ (بنی اسرائیل ۱۷:۱) ''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی''۔ یہ وہ مقام ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی معراج میں زمین سے پہلے آسمان' پھر دوسرے' پھر تیسرے' پھر چوتھے حتیٰ کہ ساتویں آسمان تک تشریف لے گئے' اور اس مقام بلند تک رسائی حاصل کی جس تک کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی مرسلؑ پہنچ پایا تھا۔ یہ اس لیے کہ آپؐ نے

اللہ تعالیٰ کی جناب میں عاجزی وفروتنی اور عبودیت کے اعلیٰ مقامات تک رسائی حاصل کرلی تھی اور وہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ عبادت کرنے والے تھے' وہ سب سے زیادہ اللہ کی عظمت کے عارف تھے اور اللہ کے حضور میں سب سے زیادہ اپنے فقر وضعف کا اظہار کرنے والے تھے۔ چنانچہ آپؐ عبودیت کے ان معانی کے ساتھ متصف تھے اور یہی وہ شرف وامتیاز تھا جس کے ساتھ آپؐ اس بلندی تک پہنچے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معنوی اور حسی رفعت کو حاصل کیا۔ معنوی اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح ۹۴:۴)''اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا''۔ لہٰذا آپؐ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذکور ہیں۔ اور حسی طور پر یوں کہ آپؐ معراج کے سفر میں اس مقام بلند تک پہنچے جس کا ذکر نبیؐ کی صحیح احادیث میں وارد ہے۔

اس مرحلے پر ایک دوسرے پہلو سے بھی عبودیت کا ذکر کیا گیا ہے' وہ یہ کہ مبالغہ کرنے والے اور حد سے بڑھ جانے والے' حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھیں تاکہ آنحضورؐ کی عظمت وشرف کے سبب سے آپؐ کو حد بشریت سے نکال کر دائرہ الوہیت ومعبُودیت میں داخل نہ کردیں' جیسا کہ سابقہ امتوں نے اپنے نبیوںؑ کے بارے میں کیا۔ اس لیے آپؐ کو (عبداً) بندہ کا نام دیا گیا ہے' تاکہ اس بات کی تاکید ہوجائے کہ آپؐ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندے ہیں اور آپؐ کو یہ رتبۂ بلند اس مقام بندگی کی وجہ سے ملا:

وممـا زادني شرفاً وتيهاً وكدت بأخمصي أطأ الثريا
دخولي تحت قولك يا عبادي وأن صيرت أحمد لي نبياً

اے اللہ تو نے مجھے اپنے قول یا عبادی میں داخل فرما کر اور احمدؐ کو میرے لیے نبی بنا کر جو بڑا اعزاز مجھے بخشا ہے' اس پر میں فخر سے جھوم اٹھا ہوں اور قریب ہوں کہ اپنے تلووں سے ثریا کو بھی روند ڈالوں۔

چنانچہ عبودیت وہ شرف ہے جس کے ساتھ بندہ' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ارتقائی منازل طے کرتا ہے اور جب سجدہ تواضع وانکساری کی بلیغ ترین صورت ہے جو عبودیت کی روح ہے تو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے قرب کا اعلیٰ مقام ہے۔

○ **غرور و سرکشی کی نفی**: معنوی علامات کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ زمین کے ساتھ

اتصال بندے کو اپنی ابتدا و انتہا یاد دلاتا ہے کیوں کہ انسان اپنی جبین کو خاک آلود کرتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ یہ اس کی پیدایش کی اصل خاک ہے اور وہ اسی خاک میں لوٹنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابتداً مٹی سے پیدا فرمایا اور قیامت کے دن اسے جزا و سزا کے لیے اسی مٹی سے اٹھائے گا۔ اور یہ معنی بلیغ ترین صورت میں سجدے کی حالت میں اجاگر ہوتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ نیند کی حالت میں انسان زمین کے ساتھ زیادہ جڑا ہوتا ہے، لیکن یہ اتصال اس ہوشمند اور عاقل شخص کا نہیں ہوتا جو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اپنی عقل سے سمجھتا ہے اور اپنی زبان سے کلام کرتا ہے اور اس کیفیت میں ہوتا ہے جو مطلوب ہوتی ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ جب یہ معنی سجدے میں ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں تو انسان کو اس کی اپنی اور اپنی نہایت کی حقیقت یاد دلا دیتے ہیں۔ یہ کیفیت ایمان میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور بندے کو آخرت اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہونے اور اپنے عاجز ہونے کی یاد دلاتی رہتی ہے، جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے مقامِ قربٰ سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ خاک جو بندے کی پیدایش کی اصل ہے، کے ذریعے تذکیر اس کے لیے تواضع اور انکساری کا باعث بنتی ہے۔

وہ جس کی چال متکبرانہ ہے اور زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتا ہے، اسے چاہیے کہ پاؤں آہستہ رکھے کیونکہ وہ خود بھی مٹی سے بنا ہے کل مٹی ہو جائے گا اور قدموں سے پامال کیا جائے گا۔ انسان بندگی کی حقیقت سے پہلوتہی تب ہی کرتا ہے جب وہ اپنی ابتدا و انتہا کی حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مطرف بن الشخیرؒ متکبرین و متفخرین کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: اے ابن آدم تو اپنی ابتدا میں پانی کا ایک ناپاک قطرہ ہی تھا اور اپنی انتہا پر ایک غلیظ مردہ ہوگا، اور اس دوران تو گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ (احیاء علوم الدین ۳/۳۴۰)

انسان تب ہی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے اور سرکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے جب اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور سجدہ اس زمین اور اس خاک میں مل جانے کی بڑی بلیغ یاددہانی ہے جو ان تمام معانی کی یاد دلاتا ہے اور ان تمام اثرات کو یقینی بناتا ہے۔

○ **حقیقتِ دنیا سے آگہی**: تیسرا نکتہ یہ کہ سجدہ اپنی ہیئت کے ساتھ دنیا اور اس کے فتنوں سے نظروں کو ہٹانے والا ہے۔ انسان جب سجدے میں ہوتا ہے تو اس کی نظر سجدے میں اس

چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کی طرف ہوتی ہے۔ وہ اس کے سوا دنیا کی کسی چیز کو نہیں دیکھتا اور اس کا ذہن آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مقدار کی طرف پھر جاتا ہے تو اسے رسولؐ اللہ کے اس ارشاد کا مفہوم سمجھ آتا ہے: اگر اللہ کی نظر میں دنیا مچھر کے ایک پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی نہ دیتا۔(سنن ترمذی 'کتاب الزہد)

جب سجدہ کرنے والا اس ہیئت میں ہوتا ہے' جب کہ وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور اپنے ربِّ اعلیٰ کے نام کی تسبیح کر رہا ہوتا ہے تو اس کے ہاں یہ دونوں اُمور' دنیا کی زوال پذیری کی معرفت اور عبودیت کی عظمت کا ادراک جمع ہو جاتے ہیں اور وہ جان لیتا ہے کہ اس کے لیے مناسب نہیں کہ دنیا کی حیثیت کو اس حیثیت سے زیادہ بڑھائے جو اس نے سجدہ میں دیکھی ہے۔ اور اس وقت اس کا دل دنیا کی زیب و زینت کی طرف راغب نہیں ہوتا اور نہ اس کی چمک ہی' اس کی بصارت و بصیرت کو اچک لیتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کی حقیقت سے منہ موڑ لے۔

سجدے کی ہیئت انسان کو یہ شعور دلاتی ہے کہ دنیا وہ نہیں ہے جس طرح کہ وہ چاہتا ہے اور نہ اُس طرح ہی ہے جس طرح شیطان اسے مزین کر کے دکھاتا ہے کہ اس میں ایسا اور ایسا سامان زیست' عمدہ چیزیں' لذتیں اور مرغوبات ہیں جو اس بات کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے لیے اپنا وقت اور اپنی مساعی صرف کرے اور ان کی فکر میں گھلتا رہے۔ سجدہ اس زعم باطل کا ازالہ کر دیتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس اعلیٰ علیّین میں ہے مسلمان کو اس کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ دنیا پرستی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے اپنی نظروں کو ہٹا لیتا ہے۔ جب بندۂ مومن اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے تو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

○ **یکسوئی:** چوتھا نکتہ مسلمان کا سجدے کی حالت میں غیر اللہ کی جانب سے عدم التفات ہے' جب کہ نماز میں قیام کے دوران اس کی نظر دنیا کی کسی چیز' کسی شخصیت' کسی قابل ذکر فرد کی طرف پھر جاتی ہے' اور اسی طرح رکوع میں بھی کوئی ایسی صورت پیش آ جاتی ہے' لیکن سجدے میں وہ کوئی ایسی چیز نہیں پاتا ہے' اور نہ وہ دنیا ہی کی کسی چیز کو دیکھتا ہے۔ گویا ہر چیز کو اس نے ترک کر دیا' ہر بشر سے بے نیاز ہو گیا' ہر نفع و نقصان کو تج دیا اور پورے گرد و پیش سے لاتعلق ہو کر اس کی توجہ

صرف اللہ کی طرف مختص ہو کر رہ گئی اور اسی کی جناب میں اس کا دل اٹک گیا۔ اسی کے ذکر سے اس کی زبان تر ہوتی ہے' اسی سے مدد کا امیدوار ہوتا ہے اور اسی کے لیے اس کی نیت خالص ہو جاتی ہے۔ وہ مکمل طور پر اللہ کی طرف یک سو ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کی طرف اس کا متوجہ ہونا بہت بعید ہو جاتا ہے۔

جب بندہ دنیا کے سحر اور اس کی محبت سے آزاد ہو گیا' اور اس سے امید' اس کے خوف اور اس کے نفع و نقصان سے بے نیاز ہو گیا تو اس نے کمال بندگی حاصل کر لیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا انحصار صرف اللہ پر ہے اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ اللہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا' اور وہی اس کی امیدوں کا مرکز ہے' جیسا کہ اس کا فرمان ہے: فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (الذّٰریٰت ۵۱:۵۰) ''پس دوڑو اللہ کی طرف''۔ یہ تو ایک معروف حقیقت ہے کہ ہر چیز جس سے وہ خوفزدہ ہوتی ہے اس سے گریزاں رہتی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی جانب کے کہ جب کوئی چیز اس سے خوفزدہ ہوتی ہے تو اسی کی طرف دوڑ کر جاتی ہے' اور یہی تعلیم نبی کریمؐ نے دی ہے۔ اسی لیے سجدہ قرب کا موقع ہوتا ہے کیوں کہ اس میں اللہ کی طرف یکسوئی اپنے کمال پر ہوتی ہے۔

○ **عاجزی و فقیری**: پانچواں نکتہ یہ کہ سجدے میں انسانی جسم کے بڑے بڑے اعضا شریک ہوتے ہیں۔ انسان جب وقوف یا رکوع میں ہوتا ہے تو اپنے بعض اعضا سے کام لیتا ہے' لیکن جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں' دونوں پاؤں' دونوں گھٹنوں' ناک اور پیشانی کے ساتھ زمین پر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پورے کا پورا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے ہے اور یہ بھی کہ اس کے سارے حواس اللہ کی ہدایت کے مطابق استعمال ہو رہے ہیں۔

پس اس کی آنکھیں' اس کے ہاتھ' اس کے پاؤں اور اس کی ہر چیز اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عاجز اور فقیر بندہ ہے' لہٰذا مناسب نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرے اور پھر اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے اللہ کی نافرمانی کرے یا قدموں کے ساتھ منکرات کی طرف چل کر جائے۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں کہ شہوات اور لذات کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ یہ معنی ہیں سجدے کے' اس شخص کے لیے جو اسے سمجھنے کے لیے اس پر غور و فکر کرتا ہے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی و فرمانبرداری کا زیادہ سے زیادہ حریص ہو اور اس کی نافرمانی سے زیادہ سے زیادہ بچنے والا ہو۔

یہ بندے کے لیے اس کے رب اور مولا سے قرب کے اسباب ہیں۔

○ **معراجِ بندگی:** چھٹا نکتہ یہ ہے کہ سجدہ انسان اور شیطان کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ وہ شیطان کے لیے محرومی اور دوری کا سبب ہے' اس لیے کہ اس کو سجدے کا حکم دیا گیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ انکار اس پر تا قیام قیامت لعنت کا سبب بن گیا۔ پھر آخرت میں اس کے لیے عذاب ہے۔ لیکن جو جھکتا ہے اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کرتا ہے' وہ اپنی عبودیت کا ثبوت دیتا ہے اور شیطان سے دشمنی کا اعلان کرتا ہے۔ شیطان کو سجدے سے انکار پر دھتکارا گیا اور اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔ لیکن تیرا معاملہ اس کے برعکس ہے' تو سجدہ کرتا ہے تو اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کے سایے میں ہوتا ہے۔

سجدے کے ساتھ جہاں انسان دنیا اور اس کے فتنے' لوگوں کی طرف مائل ہونے اور ان پر بھروسا کرنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے وہیں اس کے اعضا اور ان کے اعمال کو اللہ کی رضا و خوشنودی کے خلاف استعمال ہونے سے آزادی مل جاتی ہے۔ وہ شیطان کی گمراہ کن راہوں اور اس کی دھوکا دہ چالوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے اور شیطان لعین کے مابین دوریاں اور فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے انکار کیا مگر یہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اعلان کرتا ہے۔ چنانچہ اس طرح اسے فلاح کے کتنے اسباب میسر ہو گئے اور ایمان میں اضافے اور اللہ کی رضا کے کتنے ہی اسباب ہاتھ آ گئے۔ بے شک ہم نے اس حقیقت کو پالیا کہ سجدہ بندے کا سب سے اونچا مقام اور قرب الٰہی کی بلیغ ترین صورت ہے۔

○ **آخرت کی یاد:** ساتواں نکتہ دنیا اور آخرت کے سجدے کی یاددہانی ہے اور وہ سجدے کرنے والے مومن اور انکار کرنے والے کافر کے درمیان فرق ہے۔ بندۂ مومن کو دنیا میں سجدے کے لیے بلایا گیا تو اس نے سجدہ کیا اور کافروں کو بلایا گیا تو انھوں نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ قیامت کے دن سجدہ کرنے کی تمنا کریں گے مگر وہ اس سے روک دیے جائیں گے' سجدہ کرنے کے ارادے اور اس کی رغبت کے باوجود ایسا نہ کر سکیں گے۔ ان کی پیٹھیں تختہ ہو جائیں گی اور ان میں سے ایک بھی اس قابل نہ ہوگا کہ اپنی کمر کو خم کر کے سجدہ کر لے۔ مفسرین نے

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی معنی لیے ہیں: يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (القلم ۶۸:۴۲) ''جس روز سخت وقت آ پڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے''، یعنی ان کے اور ان کے ارادے کے مابین رکاوٹ پیدا کر دی جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا رب حقیقت کو منکشف فرمائے گا تو سب مومن مرد اور عورتیں سجدے میں گر جائیں گے لیکن جو کہ دنیا میں دکھاوے اور شہرت کے لیے سجدہ کرتا تھا' وہ باقی رہ جائے گا۔ وہ چاہے گا کہ سجدہ کرے مگر اس کی پیٹھ ایک ہی طبق بن جائے گی۔ بندہ مومن کو جب اس مقام کا خیال آتا ہے تو سجدے کی طرف مسابقت اسے اُس سخت مقام اور ہولناک موقع سے نجات وخلاصی دکھائی دیتی ہے اور وہ اسے رب عظیم کے تقرب اور دردناک عذاب سے بچاؤ کی ایک صورت دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے سجدہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سجدہ جو دنیا میں سب سے بڑی عبادت اور قربِ الٰہی کا باعث ہے وہ ان لوگوں کے لیے، جنھوں نے دنیا میں سجدہ کرنے سے پہلوتہی کی' بڑے بنے رہے' سجدہ نہیں کیا اور اللہ کے حضور میں نہیں جھکے' قیامت کے روز حسرت وندامت کے ساتھ مصیبت زدہ' جھکی ہوئی گردنوں اور ذلیل چہروں کے ساتھ ہوں گے اور یہ رسوائی کے ساتھ عذاب کی ایک بہت بڑی صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے ساتھیوں کے عذاب کی کیفیت کے سیاق میں ارشاد فرمایا: فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ (الشعراء ۲۶:۹۴) ''پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس (جہنم) میں اوپر تلے دھکیل دیے جائیں گے''۔ اور ایسا ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے: فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (النمل ۲۷:۹۰) ''ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے''۔ اور ایسا ہی حضرت معاذؓ کی حدیث سے مترشح ہوتا ہے۔ جب نبیؐ نے ان سے کہا: یعنی اے معاذ' تمھاری ماں تجھے گم کرے' کیا لوگ اپنی زبانوں کے غلط استعمال کے نتائج کے علاوہ بھی کسی وجہ سے جہنم میں اوندھے منہ گرائے جائیں گے؟ (سنن الترمذی کتاب الایمان)

عذاب کی شدید ترین صورت مشقت اور اہانت کے لحاظ سے یہ ہے کہ منکر کو منہ کے بل آگ میں پھینکا جائے، اس لیے کہ اس نے بندگی سے انکار کیا تھا۔ لیکن سجدہ کرنے والا جس نے دنیا کے اندر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں اس کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ، اس سے خیر کا سوال کرتے ہوئے اور اس کے عذاب سے بچنے کے لیے عاجزی اور انکساری اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو منہ کے بل گرایا تھا وہ اس عذاب سے نجات پا جائے گا۔ سجدے کی اس حقیقت کے استحضار کے ساتھ مسلمان کو یہ ادراک حاصل ہو جاتا ہے کہ سجدہ نجات اور بچاؤ کا سبب ہے اور بندے کے لیے رفعت اور اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذریعہ۔

لہٰذا سجدہ (جو مقام قرب ہے) پر غور کرنے والے شخص کو چاہیے کہ اس حقیقت کو فراموش نہ کرے۔ ان جملہ معانی کو جب بندہ مومن اپنے دل میں اپنے رب کی تسبیح کے ساتھ تازہ رکھتا ہے تو وہ خالص عبودیت کی معراج پر ہوتا ہے۔ بلاشبہہ وہ نماز کے دوران دعا کے لیے سب سے بڑا موقع ہوتا ہے کیوں کہ وہ مقام قرب ہے۔ اور یہ تو ایک حقیقت ہے کہ جب تم سربسجود ہو کر اللہ کے قریب ہوتے ہو تو اس کے حضور میں عجز وانکساری کے ساتھ اپنا سوال پیش کرنے کے اہل ہوتے ہو۔ تم اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کر رہے ہوتے ہو اور تمھیں اپنی فنا اور انتہا یاد آ رہی ہوتی ہے، اس حال میں کہ دنیا تمھاری نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اور تم لوگوں سے بے تعلق ہوتے ہو اور تمھارے اعضا وحواس صرف اللہ کی بندگی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور تمھارا راستہ شیطان کی راہ سے الگ ہوتا ہے۔ پھر تمھاری نظر اللہ کی جزا وسزا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

ذکر اور دعا

سجدے میں دعا کی کثرت مستحب ہے جیسا کہ ہم نے قرب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ نبیؐ کی نماز میں دعا زیادہ تر سجدے کی حالت میں بیان ہوئی ہے۔ ابن قیمؒ نے کہا ہے: ''نماز میں دعا کے سات مواقع ہیں اور ان میں سے اہم ترین سجدے کا مقام ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی کثرت سجدے میں ہوتی۔ (زاد المعاد ۱/۲۵۶)

سجدہ دعا کے لیے مختص ہے جس کے ساتھ وہ نماز میں دیگر مواقع اور شکلوں سے ممیز ہے اور

اسی بارے میں صحیح حدیث میں وارد ہے: اے لوگو' مبشرات نبوت میں سے صرف سچا خواب باقی ہے جسے کوئی مسلمان دیکھے یا اس کے لیے دِکھایا جائے۔ سنو' مجھے رکوع وسجود کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ رکوع میں اپنے رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں خوب دعا کرو اور وہ اس لائق ہے کہ اسے قبول کیا جائے (مسلم)' یعنی سجدہ قبولیت دعا کا اہم ذریعہ ہے۔

سجدے میں گریہ و زاری

سجدے میں گریہ وزاری' تاثر اور انفعال کی کمال صورتوں میں سے ہے۔ نماز میں مسلمان کا رونا زیادہ تر دو مقامات پر ہوتا ہے: قیام میں اور سجدے میں۔

قیام میں جب وہ قرآن کریم کی آیات پڑھتا یا سنتا ہے جس میں وعدہ ہوتا ہے' وعید ہوتی ہے' جنت اور جہنم کا ذکر ہوتا ہے تو اللہ کے جلال سے اس کا دل مرعوب ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں اور سجدے کا موقع اسے یاد دلاتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں گرا پڑا ہے' نیز وہ اسے اس کے ضعف اور رب ذوالجلال کی جناب میں اپنی تقصیر کو یاد دلاتا ہے۔ اسی لیے رونے کا ذکر سجدے کے ساتھ آیا ہے: اِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا (مریم ۱۹:۵۸) ''ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعًا (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۹) ''اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے''۔

پھر ان کی زبان اللہ کی عظمت اور اس کے وعدہ کی سچائی کے ساتھ ہلنے لگ جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں: سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ''پاک ہے ہمارا رب' اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا'' اور اس کے ساتھ ان کے سینوں میں جو جذبات ابھرتے ہیں الفاظ ان کی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں۔ اور آنسو اس ناقابل بیان مخفی تاثیر کی تعبیر بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتے ہیں۔ پس سجدے میں خشوع کامل کی تعریف یہ ہے کہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں عجز وانکساری اور گریہ وزاری بتمام وکمال جمع ہو جاتی ہیں۔

سجدے میں خوف و رجا

کمال سجدہ کے لوازم میں سے ہے کہ بندہ خوف و رجا کے درمیان متغیر رہتا ہے جب وہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کرتا ہے اور ابلیس کی مشابہت کی مخالفت کرتا ہے جس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا' اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہوتا جو سجدہ کرنے سے مجتنب رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ امید رکھتا ہے کہ اس کا سجدہ اللہ کی رضا کے حصول اور اس کی دعا کی قبولیت کا باعث بن جائے گا۔ لیکن جس وقت اسے ابلیس کے لیے لعنت یاد آتی ہے اور اسے وہ موقع یاد آ جاتا ہے جب آخرت میں کافروں کو سجدہ کرنے کی قدرت حاصل نہ ہوگی۔ نیز اسے ابلیس اور اس کے پیروکار بلکہ اور بھی بعض گناہگاروں کے اوندھے منہ جہنّم میں پھینکے جانے کا خیال آتا ہے تو وہ اپنے رب کے غضب سے کانپ اٹھتا ہے اور اس کے عذاب سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں آیات قرآنی میں سجدے اور امید و بیم کے درمیان یہ ربط نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (السجدة ۳۲:۱۵) ''ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے''۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایمان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں' اپنے رب کو خوف اور طمع سے پکارتے ہیں' اور رحمٰن کے بندوں کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں' جو دعائیں کرتے ہیں: اے ہمارے رب' جہنّم کے عذاب سے ہم کو بچالے' اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے۔

یہ سب مفاہیم اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ مقام تک رسائی دلاتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سزاوار ہو جاتے ہو۔ اسی لیے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے زیادہ سے زیادہ اس کی بندگی کریں' اس کے حضور میں اپنی عاجزی' زاری وانکساری کا اظہار کریں' اپنی احتیاج کو پیش کریں اور اپنے دست سوال کو اس کے حضور میں پھیلائے رکھیں۔ یہی قربِ الٰہی ہے' یہی معراج بندگی ہے اور یہی حقیقتِ سجدہ ہے!

تعلیم القرآن

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟ (القرآن)

مرتبہ: صابر قرنی

خصوصیات

۱۔ قرآنی عربی متن کے نیچے جدا جدا قرآنی لفظی عربی

۲۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ (قرآنی عربی لفظ کے نیچے اردو میں موزوں ترجمہ)

۳۔ آسان رواں ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھریؒ (لفظی ترجمہ کے نیچے الگ سے بامحاورہ ترجمہ)

۴۔ شروع میں فہرست مضامین (آیت وار یا رکوع وار خلاصہ مضامین)

۵۔ جامع اور مختصر حواشی تفسیری مباحث اور وضاحتوں پر مشتمل

۶۔ ہر صفحہ پر عربی کی استعداد پیدا کرنے کیلئے افعال، اسماء اور حروف کی تفصیل ترجمہ اور گرائمر کے ساتھ

۷۔ آخر میں رکوع وار یا سورۃ وار مختصر اور جامع تشریح

۸۔ ہر پارے کے آخر میں مشکل اور ضروری الفاظ کی لغت / مجلد مکمل لغات القرآن

نام	خصوصیات	صفحات	رعایتی ہدیہ	ڈاک خرچ ☆	سائز
تعلیم القرآن مکمل سیٹ (۳۰ پارے)	۱تا۸	۱۱۲تا۱۴۴	۷۷۳/-	۶۷/-	20×26/8
لفظی و بامحاورہ ترجمہ سیٹ (۳۰ پارے)	۱تا۳	۸۴تا۹۶	۳۵۰/-	۵۰/-	23×36/16
تعلیم القرآن جلد اول (الفاتحہ تا التوبہ)	۱تا۷	۱۰۵۶	۲۶۰/-	۳۷/-	20×26/8
تعلیم القرآن جلد دوم (یونس تا العنکبوت)	۱تا۷	زیر طبع	......	......	20×26/8
تعلیم القرآن جلد سوم (الروم تا الناس)	۱تا۷	زیر طبع	......	......	20×26/8
تعلیم القرآن جلد چہارم (لغات القرآن)	۸	زیر طبع	......	......	20×26/8

☆ رمضان المبارک میں ڈاک (VP) خرچ بذمہ ادارہ

ادارہ تعلیم القرآن

19/C منصورہ، ملتان روڈ، لاہور 54570، پاکستان
Ph: 5412949, (Res) 5432472
Email: jqurni@lhr.paknet.com.pk

سرحد میں نظامِ صلوٰۃ: برکات و امکانات

امجد عباسی

صوبہ سرحد کی مجلسِ عمل کی حکومت نے گذشتہ ڈیڑھ برس میں نفاذِ شریعت اور عوام کے مسائل کے حل کے لیے کئی اہم اور بنیادی اقدامات اٹھائے ہیں۔ ان میں نفاذِ شریعت بل' سود سے پاک اسلامی بنک کاری' عوام کو انصاف کی فراہمی کے لیے حسبہ ایکٹ' پرائمری تک طلبہ و طالبات کو مفت کتب اور یونیفارم کی فراہمی' میٹرک تک مفت تعلیم' خواتین یونی ورسٹی کا قیام' پانچ مرلہ مکانات پر ٹیکس کا خاتمہ' فحاشی و بے حیائی سے پاک معاشرے کے لیے مختلف اقدامات' سادگی اور میرٹ کلچر کا فروغ' ہسپتالوں میں شام کی او پی ڈی کا آغاز جس سے محض پانچ روپے کی فیس پر ہر طرح کے علاج معالجے کی سہولت اور مفت ایمرجنسی خدمات کی فراہمی اور خیبر میڈیکل کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دینا اور طالبات کے لیے گرلز کیمپس کا قیام نمایاں ہیں۔ یقیناً یہ اقدامات اپنی جگہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کے نتیجے میں اسلامائزیشن کے عمل کو آگے بڑھانے میں اور عوام کے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور سرحد کی سیاسی تاریخ میں یہ تاریخ ساز اقدامات گردانے جائیں گے۔ البتہ حال ہی میں نظامِ صلوٰۃ کا نفاذ نہایت اہمیت کا حامل اقدام ہے۔

مجلسِ عمل سرحد نے اپنے انتخابی منشور میں صوبہ سرحد کے عوام سے صوبے میں نفاذِ شریعت کا وعدہ کیا تھا اور بڑے پیمانے پر عوامی تائید کے حصول میں یہ ایک اہم پہلو تھا۔ چنانچہ سرحد حکومت نے اسی تناظر میں اور اپنے اس وعدے کی تکمیل اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے صوبے بھر میں نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کا اعلان کیا ہے جس کے تحت پورے صوبے میں ایک ہی وقت

پر اذان اور نماز ادا کی جائے گی اور نماز کے اوقات میں سرکاری دفاتر اور تمام کاروباری ادارے بند کر دیے جائیں گے۔ آیندہ ہر نجی و سرکاری عمارت میں مسجد کی تعمیر کے لیے جگہ مختص کی جائے گی' نیز خواتین کی سہولت کے پیشِ نظر تمام بس اڈوں اور دیگر پبلک مقامات پر وضوگاہ اور بیت الخلا کی تعمیر کو خصوصی ترجیح دی جائے گی۔ اس بات کو بھی واضح کیا گیا کہ نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے لیے قوت کے استعمال کے بجائے تلقین اور تبلیغ کو ترجیح دی جائے گی۔ مزید عملی اقدام اٹھاتے ہوئے سرحد حکومت نے علما و ائمہ کرام' خطبا حضرات اور تاجر برادری کو اعتماد میں لیتے ہوئے آزمایشی طور پر صوبائی دارالحکومت پشاور میں نمازِ جمعہ کے یکساں اوقات مقرر کر دیے ہیں جس کے تحت ایک بجے نمازِ جمعہ کی اذان ہوگی اور ڈیڑھ بجے نمازِ جمعہ ادا کی جائے گی' جب کہ ایک بجے سے لے کر دو بجے تک نمازِ جمعہ کے لیے وقفہ ہوگا جس کے دوران تمام دفاتر' تجارتی ادارے' مارکیٹیں بند رہیں گے۔ اس تجربے کے بعد دیگر نمازوں کے اوقات کا تعین کیا جائے گا اور پھر اس عمل کو پورے صوبے تک بڑھا دیا جائے گا۔ اس حکم کے تحت پشاور میں نمازِ جمعہ خوش اسلوبی سے ادا کی جارہی ہے اور تنفیذ صلوٰۃ کے عمل کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

صوبہ سرحد میں مجموعی طور پر مذہبی رنگ نمایاں ہے اور عوام کی موجودہ منتخب حکومت اور عوامی تائید کے ذریعے اسلامی نظام کے نفاذ کے امکانات روشن ہیں۔ البتہ بقول مولانا مودودیؒ ہر تجدیدی تحریک کے لیے تاریخ کا یہ سبق ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے:

> اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت' اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں وہ نقش برآب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع بھی ہو جائے' تو قائم نہیں رہ سکتا' اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔ (تجدید و احیاے دین' ص ۱۲۳)

صوبہ سرحد میں نفاذِ شریعت کے حوالے سے اسی تاریخی حقیقت کو شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کی برپا کردہ تجدید و احیاے دین کی تحریک سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ اور ان کے ساتھی ایسی پاکباز نفوس اور ہستیاں تھیں جن کو دیکھ کر عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی

لیکن انھوں نے عوام الناس کو ذہنی و اخلاقی طور پر نفاذِ شریعت کے لیے تیار کیے بغیر شریعت کو نافذ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا اور تجدید و احیاے دین کی اتنی عظیم تحریک برگ و بار نہ لا سکی۔ ماضی قریب میں صدر جنرل ضیاء الحق کے دور میں سطحی انداز میں اور عوام کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے بغیر نظامِ صلوٰۃ نافذ کرنے کی کوشش کی گئی جو نقش بر آب ثابت ہوئی اور آج وہ ماضی کا حصہ ہے۔ لہٰذا مجلسِ عمل جو ایک بار پھر سرحد میں نفاذِ شریعت کے عمل کو آگے بڑھا رہی ہے' جو بہت خوش آیند و مبارک اقدام اور ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے' اسے اس پہلو کو خاص طور پر اہمیت دینا چاہیے اور پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ نفاذِ شریعت کا یہ عمل خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچے اور دیرپا اثرات کا باعث ثابت ہو۔

اسلام اپنی معاشرت کی بنیاد خدا کی مکمل اطاعت و بندگی' خوفِ خدا' فکرِ آخرت اور اس اصول پر رکھتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں خیر اور بھلائی پھیلے اور شر اور بدی مٹ جائے۔ فرد کی اصلاح کے لیے اسلام نے جو نظامِ تربیت وضع کیا ہے وہ اسی فکر کو پروان چڑھاتا ہے اور اس میں اقامتِ صلوٰۃ اور نظامِ صلوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے اور نبی کریمؐ جیسی ہستی نے جو رحمۃ للعالمین ہیں' نماز قائم کرنے پر اس شدت سے زور دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی اور کو امام بناؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو اذان سننے کے بعد بھی گھروں میں پڑے سو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز اسلام کا وہ شعار ہے اور وہ پیمانہ ہے جس سے فوری طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنے لوگ خدا کی عملاً اطاعت کے لیے تیار ہیں اور اسی بات سے معاشرتی بگاڑ کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہی بات منافقین کو بھی نماز ادا کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

اسلام میں عبادت کا تصور محض چند مراسم عبادت کی ادائیگی کا نام نہیں بلکہ انفرادی سطح سے اجتماعی سطح تک ہر معاملے اور ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی اطاعت و فرماں برداری اور خدا کے قانون کی بالادستی کا نام ہے۔ لہٰذا محض نماز کی ادائیگی مقصود نہیں بلکہ روحِ نماز پیشِ نظر رکھنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ بڑے پیمانے پر ذہنی و اخلاقی تربیت اور راے عامہ

ہموار کی جائے۔

فریضہ اقامت دین کے تین بنیادی اور ناگزیر تقاضوں میں خدا کی اطاعت و بندگی، صالح افراد کی تنظیم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (یعنی خیر اور بھلائی پھیلے اور شر و فساد اور بگاڑ مٹے) شامل ہیں۔ نبی کریمؐ کے اسوہ سے بھی یہی رہنمائی ملتی ہے۔ آپؐ نے بھی انھی بنیادوں اور خطوط پر اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر فرمائی تھی۔ آپؐ نے لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر جس تحریکِ اصلاح کی بنیاد رکھی تھی، اس کا مطلب خدا کی مکمل اطاعت و بندگی اور غلبۂ دین تھا (مزید مطالعے کے لیے: فریضہ اقامت دین 'مولانا صدرالدین اصلاحی)۔ لہٰذا نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ میں ان تینوں پہلوؤں اور عبادت اور نماز کی روح کو پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔

معاشرتی صورت حال

نظامِ صلوٰۃ کے کامیابی سے نفاذ کے لیے پہلی ضرورت بڑے پیمانے پر اس کے حق میں راے عامہ کی ہمواری اور تیاری ہے۔ اس کے لیے معاشرے اور معاشرتی صورت حال کا بغور جائزہ لینا ضروری ہے۔ اگرچہ لوگ مسلمان ہیں لیکن ان کی عملی زندگی جدید نظریات، مغربی تہذیب یا روایتی مذہب پسندی میں بٹی ہوئی ہے۔

جدید ذہن مغرب سے متاثر ہے اور اس کے نزدیک مذہب ذاتی مسئلہ ہے اور اس کا چند مراسم عبادت سے زیادہ عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، یعنی لادینیت یا سیکولر ذہنیت کا شکار ہے۔ مذہب پسند ایک بڑا طبقہ تقلید کا شکار ہے۔ وہ نماز، روزہ، رسوم و رواج اور اپنے مسلک تک محدود ہے اور اس سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے علاوہ جدید ذرائع ابلاغ اور دوسری قوتیں بھی معاشرتی بگاڑ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ بحیثیت مجموعی شر اور بگاڑ کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ اب معاشرے کا صرف وہ صالح عنصر یا اہلِ خیر ہی رہ جاتے ہیں جن کے دل میں اسلام کے لیے محبت ہے اور وہ دل و جان سے خدا کی اطاعت اور اسلام کی سربلندی کے لیے خواہاں ہیں۔ یہی امید کی کرن ہیں اور یہی وہ قوت ہے جس کے ذریعے نفاذِ شریعت اور نظامِ صلوٰۃ کا نفاذ اور اسلامی نظام کا قیام عملاً ممکن ہے۔

معاشرہ خدا کی اطاعت کے لیے کس حد تک تیار ہے۔ اس کا ایک اندازہ نماز پڑھنے کے رجحان سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کتنی تعداد میں لوگ نماز ادا کرتے ہیں جو مقابلتاً بہت تھوڑی تعداد ہے۔ وہ لوگ جو نماز کے دیگر تقاضے پورے کرتے ہیں ان کی تعداد تو اور بھی کم ہے' تاہم صوبہ سرحد میں بحیثیت مجموعی ادائیگی نماز کا رجحان مقابلتاً بہتر ہے۔ اس معاشرتی صورت حال کو سامنے رکھنا بھی ناگزیر ہے۔

صالح عنصر پر مبنی صلوٰۃ کمیٹیاں

ان حالات میں فطری طور پر پہلی ترجیح وہ افراد یا گروہ یا عنصر ہونا چاہیے جو خود اسلام پر عمل پیرا ہے' اسلامی نظام کے نفاذ کا خواہاں ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس صالح عنصر کو منظم کرنے اور ایک مؤثر قوت میں تبدیل کرنے کے لیے ایک عملی شکل صلوٰۃ کمیٹیوں کا قیام ہے۔ گلی' محلے اور بستی کی سطح پر صلوٰۃ کمیٹیاں قائم کی جاسکتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے ارکان وہ لوگ ہونے چاہییں جو نمازی ہوں' نیک اور صالح ہوں' صاحبِ کردار ہوں اور خلقِ خدا کی اصلاح و بہتری کے لیے فکرمند ہوں اور دل دردمند رکھتے ہوں' نیز انھیں لوگوں کی تائید وحمایت حاصل ہو۔

کمیٹی کا بنیادی مقصد لوگوں کو خدا کی بندگی و اطاعت' آخرت کی فکر اور مقصدِ زندگی اور حقوق و فرائض کے حوالے سے توجہ دلانا اور نماز جو خدا کی اطاعت کی عملی مشق ہے' اس کے لیے تیار کرنا ہونا چاہیے۔ دین کے علم کے بغیر دین کی اطاعت ممکن نہیں ہوسکتی اور ہر آن بھٹکنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہٰذا کمیٹی کا یہ بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ حکومتی سرپرستی سے کمیٹی زیادہ مؤثر انداز میں کام کرسکے گی اور بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ ارکان کمیٹی کے پاس اسلام کی بنیادی تعلیمات اور نماز سے متعلق عام فہم زبان میں کتابچے اور لٹریچر بھی موجود ہونا چاہیے جو ملاقات اور گفتگو کے بعد لوگوں کو مطالعے کے لیے دیے جاسکیں۔ اس کے لیے تحریک اسلامی کا بنیادی لٹریچر: خطبات' دینیات' شہادتِ حق' سلامتی کا راستہ وغیرہ مفید رہے گا۔ مزید غور کے بعد ایک دعوتی سیٹ تیار کیا جاسکتا ہے جو ممبران صلوٰۃ کمیٹیوں کو فراہم کیا جائے۔ ہر صلوٰۃ کمیٹی

کو ایک مختصر دارالمطالعہ یا لائبریری بھی قائم کرنی چاہیے جہاں سے مطالعے اور عام لوگوں کے مطالعے کے لیے کتب فراہم کی جاسکیں۔ دارالمطالعوں کے قیام اور تقسیم لٹریچر سے عوام میں مطالعے کے ذوق اور فہمِ دین کے حصول کے لیے ایک تحریک پیدا ہو سکے گی جو رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرے گی۔

کمیٹی ہفتہ وار اجلاس منعقد کرے جس میں علاقے کی صورت حال کا جائزہ' نمازیوں کی کیفیت اور کام کو مزید بہتر بنانے کے لیے تجاویز اور لائحہ عمل پر غور کیا جائے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار درس قرآن یا دعوتی اجتماع منعقد کیا جاسکتا ہے جس میں دینی شعور کی آبیاری کی کوشش کی جائے اور لوگوں کی بھرپور شرکت کو ممکن بنایا جائے۔ کمیٹی کا ایک خصوصی ہدف فرقہ واریت کا خاتمہ' مذہبی جھگڑوں کو روکنا' باہمی تعاون اور اتفاق و یک جہتی کی فضا قائم کرنا اور لوگوں کو اس کش مکش کے نقصانات کا احساس دلانا ہونا چاہیے۔

صلوٰۃ کمیٹی کا فطری دفتر تو مسجد ہی ہے۔ اسلام میں مسجد بستی کا مرکز ہوا کرتی ہے۔ فکری رہنمائی' تزکیہ و تربیت' تعلیم و تدریس' معاشرتی مسائل کا حل' عدل و انصاف کی فراہمی' مالی معاونت' دارالمطالعہ' مسافروں کے لیے قیام گاہ' شفاخانہ' ثقافتی مرکز (کمیونٹی سنٹر) وغیرہ--- یہ تمام امور مسجد میں ادا کیے جاتے رہے ہیں اور کیے جانے چاہییں۔ تاہم' اب مسجد کو وہ مقام حاصل نہیں رہا جو ماضی میں اسے حاصل تھا (مزید مطالعے کے لیے: تعمیر معاشرہ میں مسجد کا کردار' مولانا امیر الدین مہر' دعوہ اکیڈمی' اسلام آباد)۔ لہٰذا صلوٰۃ کمیٹی کا ایک اہم مقصد مسجد کے اس مقام و مرتبے اور حیثیت کی بحالی کی کوشش ہونا چاہیے۔ اگر کسی جگہ مسجد میں کمیٹی کے دفتر کا قیام ممکن نہ ہو وہاں صلوٰۃ کمیٹی کا دفتر الگ سے قائم کیا جانا چاہیے تاکہ کام مربوط و منظم انداز میں آگے بڑھ سکے اور مطلوبہ مقاصد کا حصول ممکن بنایا جاسکے۔

فواحش و منکرات کا خاتمہ

نماز کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد فواحش و منکرات سے روکنا اور ان کا خاتمہ ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (العنکبوت ۲۹:۴۵)
یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

لہٰذا صلوٰۃ کمیٹی کا ایک اہم مقصد فواحش کی روک تھام اور ان کے خلاف عوامی ضمیر اور احساسِ شرافت کو بیدار کرنا ہونا چاہیے۔ اسلام میں فواحش و منکرات کا تصور کوئی محدود معنوں میں نہیں ہے۔ اس لیے فواحش کے سلسلے میں کسی ایک ہی پہلو پر نظر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کے تمام سرچشموں پر نگاہ رہنی چاہیے۔

فواحش کا دائرہ: قحبہ خانے، شراب خانے، سینما کی پبلسٹی، دکان پر عریاں تصاویر اور سائن بورڈ، ٹورنگ اور تھیٹریکل کمپنیاں، سرکس، مخلوط تعلیم، اخبارت و رسائل میں فحش اشتہارات و تصادیر اور فلمی مضامین، ریڈیو پر فحش گانوں کے پروگرام، دکانوں اور مکانوں پر فحش گانوں کی ریکارڈنگ، ٹیلی ویژن پر فحش و بے ہودہ موسیقی کے پروگرام اور ڈرامے، فحش فلمیں، قمار بازی کے اڈے، رقص کی مجالس، فحش لٹریچر اور عریاں تصاویر، جنسی رسائل، آرٹ اور کلچر کے نام سے بے حیائی پھیلانے والی سرگرمیاں، مینا بازار، عورتوں میں روز افزوں بے پردگی کی وبا وغیرہ پر محیط ہے۔ (تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل، ص۲۲-۲۳)

گویا فحش و منکر سے مراد تمام بیہودہ اور شرمناک افعال اور ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں، اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ٥٦٦)۔ یہ تمام پہلو بھی سامنے رہنے چاہییں۔

نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا یہ فطری تقاضا ہے کہ معاشرے میں ہر قسم کے فواحش و منکرات کا استیصال و خاتمہ ہو۔ لہٰذا صلوٰۃ کمیٹی کی ایک اہم ذمہ داری فواحش و منکرات کے خاتمے کی کوشش ہونا چاہیے۔ اس کے لیے لوگوں میں ان کی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس اجاگر کر کے انھیں معاشرتی بگاڑ کو روکنے اور فواحش و منکرات کے خاتمے کے لیے مل جل کر اجتماعی جدوجہد کے لیے تیار کیا جانا چاہیے۔ لوگوں میں اس کا احساس بھی موجود ہے لیکن منظم نہ ہونے کی وجہ سے غیر مؤثر ہیں۔ اگر لوگوں کو ان معاشرتی خرابیوں کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور منظم انداز میں لے کر چلا جائے تو اس کے نتیجے میں یہ فضا قائم ہوسکتی ہے کہ جہاں کوئی غلط اقدام ہو فوری طور پر

لوگ ایک دوسرے کو توجہ دلا کر اس کا سدباب کر دیں۔ اسلامی معاشرے کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ جہاں شر یا منکر سر اٹھائے وہیں اسے دبا دیا جائے۔ اُمت مسلمہ کا مقصدِ وجود بھی یہی ہے۔ کمیٹی کے اس اقدام سے فطری انداز میں شروفساد اور بدی کے پھیلاؤ کا راستہ رک جائے گا اور لوگ عملاً برائی سے روکنے کے فریضے کو ادا کرنے لگیں گے۔ نتیجتاً معاشرہ اخلاقی لحاظ سے بہت بلند سطح پر لے جایا جاسکے گا اور نماز کا ایک اہم مقصد فحش و منکر کا خاتمہ بھی پورا ہو سکے گا۔

جذبۂ ہمدردی اور خدمت خلق

نفسانفسی، خودغرضی، مفاد پرستی، دوسروں سے لاتعلقی اور صرف اپنی ذات تک محدود رہنا، مادیت کے شاخسانے ہیں۔ یہ اسلامی معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں۔ اسلام اجتماعیت کو فروغ دیتا ہے۔ اُمت کا تصور، جسدواحد کا تصور، مسلمان کا مسلمان کا بھائی ہونا، اخوت و محبت، ہمدردی و خیرخواہی، یہ سب تصورات اسی سوچ کو آگے بڑھانے کے لیے ہیں۔ نماز فطری انداز میں اسلامی معاشرت کے اس پہلو کے فروغ کا ذریعہ ہے۔

مسلمان نماز کی ادائیگی کے لیے جب اکٹھے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے احوال سے آگہی ہوتی ہے۔ کوئی پریشان حال ہے، کوئی فاقہ زدہ ہے، کوئی بیمار ہے، کوئی بے بس ولاچار ہے، کوئی کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے، کوئی مالی مشکلات کا شکار ہے، کوئی کسی صدمے سے دوچار ہے، کسی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے، غرض یہ سب باتیں ایک دوسرے کو قریب کرنے والی، ایک دوسرے سے محبت اور تعلق بڑھانے والی، جذبہ ہمدردی و خیرخواہی کو فروغ دینے اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔ معاشرے کی عمومی صورت حال تو جو ہے، سو ہے، خود نمازی حضرات جو ایک عرصے سے اکٹھے نماز ادا کرتے ہیں، اس پہلو سے غفلت برتتے ہیں۔ (مزید مطالعے کے لیے: اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، مولانا مودودیؒ)

صلوٰۃ کمیٹی کو نماز کی اس روح کو بیدار کرنے، اجتماعیت کے فروغ، جذبۂ ہمدردی و خیرخواہی کے احیا کے لیے خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس غرض کے لیے نہ صرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے اور اخلاقی تلقین کی جائے بلکہ آگے بڑھ کر اہلِ علاقہ کے مسائل میں بھی دل چسپی لی

جائے۔ان کے حل کے لیے شریف و صالح عناصر کو منظم کر کے اجتماعی جدوجہد کی جانی چاہیے۔

خدمتِ خلق کے چند اہم پہلو

اس ضمن میں درج ذیل امور خصوصی توجہ چاہتے ہیں:

اخلاقی حوالے سے:

۱-غنڈہ گردی کا انسداد ۲-ہر قسم کے فواحش کا تدارک ۳-رشوت و خیانت (کرپشن) کی روک تھام۔

معاشی حوالے سے:

۱-سرکاری محکموں اور اداروں سے عام لوگوں کی شکایات رفع کرانا اور دادرسی حاصل کرنے کے معاملے میں جس حد تک ممکن ہو ان کی مدد کرنا۔

۲- اپنی مدد آپ کا جذبہ بیدار کرنا تاکہ لوگ خود ہی مل جل کر بستیوں کی صفائی' راستوں کی درستی اور حفظانِ صحت کا انتظام کرلیں۔

۳- توخذ من اغنیاء هم فترد علٰی فقراء هم کے شرعی اصول پر بستیوں کے غریبوں' محتاجوں اور معذوروں کی باقاعدہ اعانت کا انتظام اور اس کے لیے انھی بستیوں کے ذی استطاعت لوگوں سے مدد لینا۔اس غرض کے لیے زکوٰۃ' عشر اور صدقات کی رقوم کی تنظیم اور بیت المال کے ذریعے ان کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام کرنا۔(تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل سے ماخوذ)

صلوٰۃ کمیٹی کے ان اقدامات کے نتیجے میں جذبہ خیرخواہی و ہمدردی کو فروغ ملے گا۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے رجوع کریں گے۔ معاشرتی انتشار و ابتری میں کمی واقع ہوگی۔ وہ لوگ جو اپنے مسائل کے ہاتھوں پریشان ہو کر اور کسی پُرسانِ حال کے نہ ہونے کی وجہ سے مایوسی کے مارے خودکشی پر مجبور ہو رہے ہیں' انھیں ایک نیا حوصلہ' امید کی کرن اور زندگی کی اُمنگ ملے گی۔ حکومتی سرپرستی کے علاوہ بہت سے ہاتھ ایک دوسرے کو سنبھالنے کے لیے میسر آئیں گے۔

تنازعوں کا تصفیہ

چھوٹے چھوٹے جھگڑے ابتدا ہی میں گلی محلے کی سطح پر اگر حل کر لیے جائیں تو بڑے جھگڑوں کی بنیاد نہیں بنتی۔ ان مسائل پر توجہ دینے سے صلوٰۃ کمیٹی کے ذریعے پنچایت کے انداز میں فراہمی انصاف کی سبیل بھی پیدا ہو سکے گی اور مسجد جو کبھی عدل و انصاف کی فراہمی کا ذریعہ تھی' ایک بار پھر اس کا یہ مقام بھی بحال ہو سکے گا۔ اس طرح حکومتی سرپرستی سے بآسانی لوگوں کے مسائل گھر کی دہلیز پر حل ہو سکیں گے اور عدل و انصاف کی فراہمی میں بہتری اور آسانی پیدا ہوگی۔

فروغِ تعلیم و تدریس

اسلام حصولِ علم پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن مجید سے رہنمائی اور نماز سے صحیح استفادے کے لیے نماز کا مفہوم سمجھنا اور قرآنی و دینی تعلیمات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا تعلیم کا فروغ نظامِ صلوٰۃ کا فطری تقاضا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے مدرسہ صفہ کے نام سے مسجد نبویؐ میں نبی کریمؐ کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ مسجد ہمیشہ سے تعلیم و تدریس کا مرکز اور فروغِ دین کا ذریعہ رہی ہے۔ آج بھی بڑی تعداد میں مدارس موجود ہیں۔ لوگوں میں تعلیم کے فروغ' شرح خواندگی میں اضافہ' ذہنی شعور کی آبیاری' اسلامی تعلیمات سے آگہی کے لیے مسجد کو بطورِ مکتب و مدرسہ بآسانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی یہ ناگزیر ہے۔

صلوٰۃ کمیٹی مساجد کے ذریعے مسجد مکتب اسکیم کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ ایک مدرس کی بنیاد پر محدود پیمانے پر اسکول قائم کیا جا سکتا ہے۔ حکومت سرحد تعلیم کے فروغ اور بے روزگاری کے مسئلے کے حل کے لیے ۲۰ ہزار مراکز تعلیمِ بالغاں قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ مراکز بھی مساجد کی بنیاد پر بآسانی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ مساجد میں کوچنگ سنٹر قائم کر کے طلبہ کو بلامعاوضہ ٹیوشن کی سہولت فراہم کی جاسکتی ہے۔ جہاں سرکاری نصاب پڑھانے کے ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام ہو۔ اسی طرح مسجد میں دارالمطالعہ قائم کیا جا سکتا ہے جو ذوق مطالعہ کے فروغ اور تسکین کا باعث بن سکتا ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے یہ اقدامات صلوٰۃ کمیٹی کے ذریعے اٹھائے جانے چاہییں۔ اسی طرح شعور' آگہی اور تعلیم کے میدان میں بتدریج انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

صحت و صفائی اور ماحول کی بہتری

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ اسلام میں صفائی اور حفظانِ صحت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ صحت مند مسلمان (قوی مسلمان) کو کمزور مسلمان سے بہتر کہا گیا ہے۔ نماز کی ادایگی کے لیے لباس کی صفائی اور ذوقِ جمال کا اہتمام' وضو اور غسل کے احکامات' خوشبو کا استعمال وغیرہ اسی حکمت کے غماز ہیں۔ لہٰذا نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ لوگوں کو صفائی ستھرائی' ماحول کی بہتری اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے آگاہ کیا جائے۔ ماحولیاتی آلودگی' کوڑے کرکٹ کے ڈھیر' صاف پانی کا میسر نہ ہونا' کھلے ہوئے مین ہول اور گندے پانی کا بہنا' راستے کی مختلف رکاوٹیں' اسٹریٹ لائٹ کا روشن نہ ہونا' یا نصب نہ ہونا' گلی اور سڑک کے اطراف میں درختوں کے سائے کی کمی وغیرہ--- اس نوعیت کے اور بہت سے مسائل ہیں جن کا عوام کو سامنا ہے اور جو ماحولیاتی آلودگی میں اضافے کا باعث ہیں۔ یہ حفظانِ صحت کے اصولوں کے منافی ہیں اور اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہیں۔

جس طرح مسجد کی تزئین و آرایش اور صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح اگر گلی محلوں کی صفائی اور ماحول کی بہتری پر بھی توجہ رہے اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے بھی آگہی ہو تو بہت سی بیماریوں' وباؤں اور تکالیف سے بھی نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر علاج معالجے پر اٹھنے والے اخراجات سے معمولی تدابیر پر عمل کر کے بچا جاسکتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال ڈھائی لاکھ بچے ہیضے کی وجہ سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ یہ شرح صحیح طرح ہاتھ دھونے اور دیگر حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنانے سے ۵۰ فی صد تک بآسانی کم کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ کھانے سے قبل ہاتھ دھونا سنت ہے۔ اگر مسجد کے ساتھ ایک مختصر شفاخانہ یا ڈسپنسری بھی قائم کرلی جائے تو عوام کو علاج معالجے کی سہولت بھی میسر آسکتی ہے جہاں حفظانِ صحت کے اصولوں کے علاوہ ابتدائی طبی امداد وغیرہ کے اصول بھی سکھائے جاسکتے ہیں۔

اگر صلوٰۃ کمیٹی اس پہلو پر بھی توجہ دے اور اسلامی تعلیمات کے پیشِ نظر لوگوں کو توجہ دلائے اور ان کی اصلاح و تربیت کرے' اور اپنی مدد آپ کے جذبے کے تحت ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے تو اس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے میں ان مسائل کو حل کیا جاسکے گا'

ماحول کو بہتر بنایا جاسکے گا اور ماحولیاتی آلودگی کے مسئلے پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے۔

نظامِ صلوٰۃ اور خواتین

خواتین ہماری آبادی کے کم و بیش نصف پر مشتمل ہیں۔ معاشرے کی تعمیر میں خواتین کا بنیادی کردار ہے اور اسے فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ خواتین پر نماز باجماعت کی پابندی تو عائد نہیں کی' تاہم نمازِ جمعہ اور عیدین کے اجتماع میں خواتین کی شرکت کی تاکید اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خواتین کی تربیت کے لیے ناگزیر ہے اور اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ مجلسِ عمل کی حکومت نے اس پہلو کو بھی نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے وقت پیشِ نظر رکھا ہے اور خواتین کے لیے الگ وضوگاہوں اور نماز کے لیے الگ جگہ کا تعین و اہتمام اس کا ثبوت ہے۔

اسلامی تعلیمات کے فروغ و اشاعت اور تعمیر و تطہیر افکار کے لیے جس طرح مردوں پر مشتمل صلوٰۃ کمیٹیوں کے ذریعے ہفتہ وار درس قرآن اور تربیتی اجتماعات کا اہتمام کیا جانا چاہیے' اسی طرح خواتین کی سطح پر خواتین کی کمیٹیاں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کا بنیادی مقصد خواتین میں اسلامی تعلیمات کا فروغ اور جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے گلی محلے کی سطح پر ہفتہ وار درس کے حلقے بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ شرکا خواتین میں لٹریچر تقسیم کیا جاسکتا ہے اور دارالمطالعوں سے کتب کے حصول اور استفادے کی کوئی سبیل نکالی جاسکتی ہے۔ طالبات میں تعلیم کے فروغ کے لیے بچیوں کے لیے مسجد مکتب اسکول قائم کیے جاسکتے ہیں اور دستکاری اور ووکیشنل تعلیم بھی دی جاسکتی ہے۔

خواتین کا نماز اور دیگر مواقع پر جمع ہونے سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت' مسائل میں دل چسپی' مالی معاونت (صلوٰۃ کمیٹی کے تحت جمع زکوٰۃ و صدقات کی مدد سے) جذبۂ محبت و خیرخواہی کے فروغ کا باعث بھی ہوگا جو اسلامی معاشرت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

خواتین کی ان سرگرمیوں کا مرکز بھی مسجد کو ہونا چاہیے۔ اس طرح خطبات جمعہ' ہفتہ وار درس قرآن کے حلقوں' تقسیم لٹریچر' مطالعہ کتب' دارالمطالعوں سے استفادے اور باہمی محبت و خیرخواہی کے نتیجے میں خواتین کے لیے فہم دین' تعلیم و تربیت اور اخوت و محبت کا ایک مربوط'

منظم اور ہمہ گیر نظام فطری انداز میں آگے بڑھنے لگے گا۔ یہ بھی نماز اور نظامِ صلوٰۃ کی برکتوں سے ممکن ہو سکے گا۔

رمضان میں خصوصی اہتمام

خوش قسمتی سے رمضان المبارک کے مبارک ماہ کی بھی آمد آمد ہے۔ رمضان میں فطری انداز میں بحیثیت مجموعی ماحول پر اسلامی رنگ غالب ہوتا ہے۔ لوگوں میں خدا کی اطاعت و بندگی' نیکی و پرہیزگاری' صلہ رحمی اور برائیوں سے بچنے کا جذبہ فزوں تر ہوتا ہے۔ نیکیوں کے اس موسمِ بہار میں نظامِ صلوٰۃ کو اس کی روح اور اس کے تمام تر تقاضوں کے پیشِ نظر نافذ کرنا سہل بھی ہوگا اور عوامی تائید اور تعاون بھی بآسانی حاصل ہو سکے گا۔ لہٰذا اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ترجیحاً اہمیت دی جائے اور خصوصی اہتمام کیا جائے۔

رمضان میں خاص طور پر فواحش اور منکرات کے خاتمے اور معاشرتی برائیوں کے انسداد کے لیے نظامِ صلوٰۃ کے ذریعے باقاعدہ ایک مہم چلائی جانی چاہیے۔ جس طرح لوگ روزے کے احترام میں برسرِعام خدا کے احکامات کی نافرمانی نہیں کرتے' اسی طرح نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑا' ظلم و زیادتی' رشوت ستانی' فحاشی کے ارتکاب' بے حیائی و بے پردگی وغیرہ کے خاتمے کے لیے بھی اجتماعی جدوجہد کریں۔ عوام الناس کے مسائل کے حل میں دل چسپی لیں بالخصوص ماحول کو آلودگی سے بچانے' گلی محلے کی صفائی ستھرائی پر خصوصی توجہ دیں کہ یہ بھی نماز کا ایک اہم تقاضا ہے۔ یوں بحیثیت مجموعی نیکی فروغ پائے گی اور بدی مٹے گی' اور معروف کا چلن عام ہوگا اور منکرات دبیں گے۔ جہاں خرابی سر اٹھائے گی وہیں اس کی سرکوبی ہو سکے گی' اور صحیح اسلامی معاشرت کا نمونہ سامنے آئے گا جس کے اثرات رمضان کے بعد بھی قائم رہ سکیں گے۔

دعوت عمل

سرحد نے تو راستہ دکھایا ہے۔ پورے ملک میں' سرکاری سرپرستی کے بغیر بھی' اہل محلہ اس نظام کو قائم کر سکتے ہیں اور بلدیاتی سطح پر یونین کونسل اور ٹاؤن کا ناظم اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت رکاوٹ نہیں۔ سماجی تنظیمیں' اصلاح معاشرہ کی تحریکیں' سیاسی و دینی جماعتیں اپنی

اپنی جگہ پر نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے لیے کوشش کریں تو ملک گیر اصلاح معاشرہ اور ملک وملت کی تعمیر کی ایک تحریک برپا کی جاسکتی ہے۔

نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے حوالے سے اگر ان امور کو پیشِ نظر رکھا جائے اور محض مراسمِ عبادت سے آگے بڑھتے ہوئے روحِ نماز اور اس کے تقاضوں پر نظر رہے تو صرف نظامِ صلوٰۃ کی برکت سے ہی معاشرے کی صورت حال کافی حد تک بدل سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے بڑے پیمانے پر تطہیر و تعمیر افکار کا عمل آگے بڑھے گا' اسلامی تعلیمات سے آگہی کے نتیجے میں دینی شعور عام ہوگا۔ صلوٰۃ کمیٹیوں کے قیام کے ذریعے اسلام کے لیے مخلص اور تن من دھن سے قربانی دینے والے اور معاشرے کے صالح اور شریف عنصر کو منظم کرنے میں مدد ملے گی' نیز فواحش و منکرات' شر اور بدی دبے گی اور نیکی' خیر اور معروف کو فروغ ملے گا۔ معاشرتی بگاڑ کے اضافے میں روک لگے گی۔ جذبہ ہمدردی و خیرخواہی کے فروغ پانے سے عوام الناس کی پریشانیوں اور مسائل میں کمی واقع ہوگی' اپنی مدد آپ کے تحت مسائل حل ہوں گے۔ بہت سے ہاتھ بیک وقت ایک دوسرے کو سنبھالنے اور دکھ درد بانٹنے اور سہارا بننے کے لیے موجود ہوں گے۔ مسجد مکتب' دارالمطالعوں اور درس کے حلقوں کے ذریعے تعلیم عام ہوگی اور شرح خواندگی اور ذہنی شعور میں اضافہ ہوگا۔ صحت و صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنانے کے نتیجے میں ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ حل ہوگا اور بیماریوں اور وباؤں سے نجات بھی ملے گی۔ ایک طرح سے راے عامہ کی ہمواری' معاشرے کی تنظیم' معاشرتی بگاڑ کا سدباب' جان و مال کے تحفظ' عدل و انصاف کی فراہمی' معاشی آسودگی' تعلیم وصحت کی سہولت جیسے بنیادی مسائل کے حل کی طرف پیش رفت ہوسکے گی جو ایک اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کو اگر اس کی پوری روح کے ساتھ نافذ کیا جائے تو اس کے نتیجے میں اسلامی نظام کے قیام' فریضہ اقامت دین کے مراحل (خدا کی اطاعت و بندگی' تنظیم معاشرہ' امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی تکمیل' اصلاح معاشرہ اور اصلاح حکومت کا عمل فطری انداز میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جو بتدریج پایدار اور دیرپا اثرات کی حامل تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس طرح نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے ذریعے دراصل اصلاح اصلاح معاشرہ اور اسلامائزیشن کی ایک تحریک ہے جو

جاری وساری ہوجاتی ہے۔

خدا کرے کہ یہ مبارک اقدام اسلامی انقلاب کی منزل کو قریب لانے کا باعث بنے اور بتدریج غلبۂ اسلام کا مرحلہ بھی آجائے۔ یقیناً نظامِ صلوٰۃ کی اسی اہمیت کی وجہ سے قرآن پاک نے فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (الحج ۲۲:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے۔

اخبارِ اُمت

قاضی حسین احمد ناروے میں

عبدالغفار عزیز

۹/۱۱ کے واقعات نہ ہوتے تو محترم قاضی حسین احمد کو دو سال پہلے ناروے آنا تھا۔ ۲۱ اگست سے شروع ہونے والے پانچ روزہ دورے سے واپس جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر اُس وقت یہ دورہ ہوجاتا تو شاید حالیہ پروگرام کا عشر عشیر بھی نہ ہوتا۔ اسلامک کلچرل سنٹر کے ذمہ دار بتا رہے تھے کہ آج تک کسی مسلمان رہنما کو اس بڑے پیانے پر کوریج نہیں دی گئی۔ ۲۱ اگست کو اوسلو پہنچنے پر تمام ٹی وی چینلوں نے ایئر پورٹ سے براہ راست ان کا استقبال دکھایا اور پھر ناروے کے قیام کے دوران کا ہر لمحہ ریکارڈ و نشر کیا۔ تمام اخبارات نے صفحہ اول کی بڑی بڑی شہ سرخیوں سے قاضی صاحب کی آمد و گفتگو کا ذکر کیا اور پھر علیحدہ علیحدہ مفصل انٹرویو بھی مکمل دو دو صفحات پر نشر کیے۔

قاضی صاحب کی ناروے آمد کا اعلان ہوتے ہی ناروے کے سب سے بڑے اخبار آفتن پوستن نے بڑی تصویر کے ساتھ شہ سرخی جمائی: اسامہ بن لادن کا پشتیبان اوسلو آ رہا ہے۔ پھر ہر اخبار، ٹی وی اور ریڈیو نے قاضی صاحب کو خطرناک ترین انسان قرار دینے میں کسر نہ چھوڑی۔ ان کے ناروے داخلے پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا اور حکومت یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ ہم مکمل تحقیقات کرنے کے بعد ہی اجازت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کریں گے۔

دورے کی مخالفت کرنے والوں کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ ناروے شینگن (Shengen) ریاستوں کا رکن ہے اور اس سے پہلے دو شینگن ریاستیں ہالینڈ اور بلجیم قاضی حسین احمد کے اپنے ہاں آنے پر پابندی لگا چکی ہیں' اس لیے اب وہ ناروے بھی نہیں آسکتے۔ ہم نے اپنے میزبانوں اسلامک کلچرل سنٹر کے ذریعے نارویجین میڈیا کو اور اسلام آباد میں نارویجین سفارت خانے کے قائم مقام سفیر ایلف راسلیم کو بھی بتایا کہ بلجیم کے سفیر خود قاضی صاحب کے پاس جاکر اور ہالینڈ کے سفارت کار راقم سے تفصیلی ملاقات میں بتا چکے ہیں کہ انھیں قاضی حسین احمد یا ان کے دورے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کے بعض اندرونی مسائل یورپین پارلیمنٹ کے انتخابات اور ان کی میزبان تنظیم یورپین عرب لیگ کے کچھ معاملات ہیں جن کے باعث ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بار اپنا دورہ ملتوی کردیں' آیندہ آپ جب بھی جانا چاہیں گے ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا' بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم خود آپ کے میزبان ہوں۔

ہمیں ۲۱ اگست کی صبح لاہور سے ناروے جانا تھا لیکن ۱۹ اگست کی شام تک ناروے حکومت کا کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا تھا۔ قاضی صاحب البتہ یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ چونکہ ناروے پاکستان معاہدے کے مطابق دونوں ممالک کے سرکاری پاسپورٹ رکھنے والے افراد کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج اگر ایک مخصوص لابی کے پروپیگنڈے کے دباؤ میں آکر دورہ منسوخ کردیا جائے تو اس سے پورے یورپ میں مقیم پاکستانی کمیونٹی اس مسلسل خطرے سے دوچار ہوسکتی ہے کہ جب بھی کوئی مخصوص لابی ان میں سے کسی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کردے اس کے خلاف کارروائی عمل میں آجائے۔ اس لیے وہ بہرصورت ناروے جائیں گے۔

اسلامک کلچرل سنٹر ناروے کے صدر میاں وقاص وحید مسلسل رابطے میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ذرائع ابلاغ روزانہ قاضی صاحب کے ایسے ایسے دوروں' انٹرویو اور بیانات کی جھلکیاں دکھا رہے تھے کہ جو اس سے قبل ہم نے نہیں دیکھی تھیں۔ لیکن الزامات اور صبح و شام چلنے والی مخالفانہ مہم کے باوجود ہمارے ساتھی خوفزدہ ہونے یا دباؤ میں آنے کے بجائے مزید جوش و جذبے سے سرشار ہیں۔ خود کئی نارویجین ذمہ دار اور تنظیمیں قاضی صاحب کے ناروے آمد کے حق میں بیانات دے رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ''ایک جمہوری ملک میں اظہار رائے پر

پابندی کیوں کر لگائی جاسکتی ہے۔ ہمیں ان کی بات سننے کا موقع دیا جائے''۔

۱۹ اگست کو بعد مغرب اسلام آباد سے ناروے کے سفیر کا فون آیا۔ وہ کہہ رہے تھے: ''عزیز صاحب' مبارک ہو۔ ہماری وزیر مقامی حکومت نے ابھی کچھ دیر پہلے اوسلو میں ایک بھرپور پریس کانفرنس کی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ ''قاضی حسین احمد کے ناروے آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اور یہ کہ میں خود بھی ان سے مل کر خواتین کے حقوق اور ناروے میں مقیم پاکستانی نژاد نارویجین کمیونٹی کے مسائل پر بات کروں گی''۔

۲۱ اگست کی شام براستہ لندن اوسلو پہنچے تو پورا نارویجین میڈیا ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان اور ناروے کے پرچم لیے کھڑی تھی جن میں سرفہرست برطانیہ سے اس پروگرام کے دوسرے مہمان خصوصی ہاؤس آف لارڈز کے رکن لارڈ نذیر احمد اور معزز پاکستانی باشندے تھے۔ لارڈ نذیر احمد مغربی دنیا میں مسلمانوں کے بہت مؤثر و بلند بانگ ترجمان کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔ جس پروگرام میں بھی جائیں' حاضرین کے دل موہ لیتے ہیں۔ لارڈ احمد برطانوی تاریخ کے وہ پہلے رکن پارلیمنٹ ہیں جنھوں نے اپنا حلف قرآن پاک پر اٹھایا ہے۔ اوسلو ایئرپورٹ پر ایک لاعلم صحافی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ایک برطانوی لارڈ پاکستان سے آنے والے ایک خطرناک لیڈر کے استقبال کے لیے اپنے اہلِ وطن کے ہمراہ کھڑا ہے۔

قاضی صاحب نے استقبال کے لیے آنے والے تمام افراد سے فرداً فرداً مصافحہ کیا اور پھر اپنی نشریات روک کر ایک ''بنیاد پرست'' لیڈر کی آمد کی خبر دینے والے ٹی وی کے نمایندوں اور صحافیوں سے مخاطب ہوئے: ''میں پاکستان سے اپنے نارویجن دوستوں کے لیے امن' محبت اور دوستی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اسلام صرف پاکستانیوں یا مسلمانوں کے لیے نہیں' پوری انسانیت کے لیے سلامتی کا پیغام رکھتا ہے۔ اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب کے درمیان اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن یہ اختلاف بھی انسانی معاشرے کی بہتری کا باعث بن سکتا ہے۔ میں چند روز کے لیے ناروے میں ہوں۔ اس دوران آپ سب سے تفصیلی ملاقات اور تبادلۂ خیال ہوگا۔ میرے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں' میں ان سب کی وضاحت کروں گا''۔

اتوار کی شام تحفظ پاکستان کانفرنس تھی۔ آغاز سے پہلے ہی اوسلو کے قلب میں واقع بڑے آڈیٹوریم کی نشستیں اور راہداریاں تنگی داماں کا شکوہ کرنے لگیں۔ آغاز میں بچوں نے تلاوت' نعت اور ترانوں پر مشتمل پروگرام پیش کیا۔ لارڈ نذیراحمد نے اپنے گرم جوش خطاب میں امریکا اور مغربی ممالک کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی۔ اپنی گفتگو کے آغاز میں انھوں نے کئی سیاسی لطیفے بھی سنائے جن میں سے ایک یہ تھا کہ جہنم کے دروازے پر بہت سی گھڑیال لگے تھے۔ فرشتے سے پوچھا گیا کہ یہ گھڑیال کیا ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ انسانوں کے جھوٹ کا پیمانہ ہے' جونہی کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کے گھڑیال کی سوئیاں جھوٹ کے درجے کے مطابق چلنے لگتی ہیں۔ دریافت کیا گیا کہ صدر بش کا گھڑیال کہاں ہے؟ فرشتے نے جواب دیا: وہ اتنا تیز چل رہا ہے کہ ہم اسے پنکھے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

لارڈ نذیراحمد نے یورپ میں مقیم مسلمانوں کی طرف سے کہا کہ یورپ میں بسنے والے مسلمان یہاں کے برابر کے شہری ہیں۔ انھیں ان کے حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا اور نہ انھیں دوسرے درجے کے شہری ہی قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ پاکستان کو زیادہ اہم مقام ملنا چاہیے کیونکہ انھوں نے یورپ کی تعمیر و ترقی کے لیے زیادہ محنت اور جدوجہد کی ہے۔

محترم قاضی حسین احمد نے انتہائی مصروف پانچ دن گزارے' تحفظ پاکستان کانفرنس میں کلیدی خطاب کیا' دیگر متعدد خطابات کیے جن میں اوسلو یونی ورسٹی میں مسلم اسٹوڈنٹس سوسائٹی کے زیراہتمام 'مقصد زندگی' کے عنوان سے لیکچر' ناروے میں مقیم عرب کمیونٹی کے ادارے رابطہ اسلامی کے مرکز میں 'اسلام اور مغرب' کے عنوان سے خطاب اور پاکستانی چنیدہ افراد کی عشائیے اور سنٹر کے ارکان و کارکنان کے اجتماعات کے خطاب شامل تھے۔ ان میں اسلام' پاکستان جماعت اسلامی' متحدہ مجلس عمل اور عالمِ اسلام سے متعلق پائے جانے والے تمام اشکالات و سوالات کا جواب دیا۔ انھوں نے مقصد بعثت نبویؐ کا حقیقی مقصد قیامِ عدل و انصاف کو واضح کیا اور دورحاضر میں پائی جانے والی بے انصافیوں اور اس ضمن میں دُہرے معیاروں کا ذکر کیا کہ فلسطین اور کشمیر میں تو ہزاروں انسانوں کا قتل عام کرنے والوں کی مکمل پشت پناہی کی جاتی ہے لیکن الزامات عالمِ اسلام اور خاص طور پر اہلِ اسلام پر دھرے جاتے ہیں کہ یہ دہشت گرد ہیں۔

بات دنیا کو دہشت گردی سے پاک امن کا گہوارہ بنانے کی کی جاتی ہے لیکن کلچر اور تہذیب وہ عام کیا جا رہا ہے کہ لوگ دین سے دُور ہوں اور جرائم کی دلدل میں دھنستے چلے جائیں۔ ہزاروں چینل صرف عریانی اور جرائم پر مشتمل پروگرام دکھاتے ہیں۔

قاضی صاحب نے اس دور میں پائی جانے والی بے انصافیوں اور انسانیت کو درپیش خطرات کا بھی ذکر کیا کہ روح انسانی اضطراب کا شکار ہے۔ جرائم اور دہشت گردی میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ انسان نے خود کو خدا قرار دے لیا ہے۔ اللہ کے نظام کے بجاے خواہشات کا نظام مسلط کیا جا رہا ہے اور پوری دنیا پر قبضے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

سوالات بہت متنوع تھے لیکن لیکچر کے بعد کے سوالات ہوں یا پریس کانفرنس کے وزرا کی ملاقاتیں ہوں، یا ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ذمہ داران کی، سب کا محور وہی گھسا پٹا پروپیگنڈا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ یونی ورسٹی لیکچر میں جنسی آوارگی اور فحاشی و بہیمیت کے علم بردار کچھ لوگ بہت تیاری سے آئے تھے۔ ہال کے مختلف کونوں میں بیٹھے ان مختلف العمر لوگوں نے ایک ہی جیسے سوالات کیے۔ قاضی صاحب نے ان سوالات کو ناشائستہ قرار دے کر ان کا جواب نہیں دیا لیکن ان سوالات نے پورے مغربی معاشرے کو ننگا کر دیا۔ دنیا کو نظام اور انسانی حقوق کا درس دینے والے اور اسلام کو دہشت گردی کے مترادف قرار دینے والے اس بات پر مصر ہیں کہ مردوں کو مردوں سے اور عورتوں کو عورتوں سے شادیاں کرنے کی آزادی ہی نہیں قانونی حق دیا جائے۔

مقامی حکومتوں کی وزیر ارنا سولبرگ سے ملاقات بہت مفید اور دل چسپ رہی۔ یہ خاتون وزیر نارویجی حکومت میں بہت اہمیّت رکھتی ہیں۔ سفیر بتا رہے تھے کہ اگر آیندہ انتخابات میں ان کی پارٹی جیت گئی تو ہوسکتا ہے وہ وزیراعظم بن جائیں۔ انھوں نے کہا کہ جو پاکستانی بچے ناروے میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور نارویجی شہری قرار پائے ان کے رہن سہن، کلچر اور مسائل کو پیشِ نظر رکھا جانا چاہیے۔ قاضی صاحب نے ان کی بات سے اصولی اتفاق کیا اور کہا کہ نارویجی معاشرے اور حکومت کو ان بچوں کے والدین کو بھی یہ حق دینا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی اپنے دین اور مذہب کے مطابق تربیت دے سکیں۔ ناروے میں تو الحمدللہ ہماری بچیوں کو شکایت

نہیں' لیکن اگر فرانس میں بچیوں کو سر پر اسکارف رکھنے اور حجاب کی اجازت نہیں دی جائے گی تو یہ دوسروں کی مذہبی آزادی سلب کرنا ہی قرار پائے گا۔

سابق وزیراعظم' سابق وزیرخارجہ اور پارلیمنٹ میں خارجہ امور کمیٹی کے سربراہ سے تفصیلی ملاقات میں دہشت گردی کیا ہے' کیوں ہے' کشمیر' فلسطین اور چیچنیا و عراق' افغانستان میں ریاستی دہشت گردی سے دنیا کو کیا کیا خطرات لاحق ہوگئے ہیں جیسے موضوعات پر بھی بات ہوئی۔

ناروے حقوق انسانی کے حوالے سے اس وقت دنیا میں پہلے نمبر پر آتا ہے' جہاں بے روزگار بھی بے روزگار نہیں ہوتا' حکومت وظیفہ دیتی ہے۔ انسان تو انسان حیوانات کے حقوق بھی طے ہیں۔ ایئرپورٹ جاتے ہوئے جمیل بھائی نے ایک پُل دکھاتے ہوئے کہا کہ مرکزی سڑک پر بنا یہ پُل انسانوں کے لیے نہیں ہے۔ دونوں طرف واقع جنگلات کے جانوروں کے لیے ہے۔ جنگلات سے درخت کاٹنا یا جانور شکار کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ اگر کوئی درخت کاٹنا ناگزیر ہو تو اسی تعداد میں دوبارہ درخت لگانا پڑتے ہیں۔

تعلیم اور تعلیمی اداروں کی دیکھ بھال سب کی ترجیح اول ہے۔ ایک اسکول کے قریب سے گزرے تو سڑک ڈیڑھ کلومیٹر لمبی سرنگ میں بدل گئی۔ معلوم ہوا کہ اس اسکول کے بچوں نے ایک دن ہڑتال کر کے مطالبہ کیا کہ شور' آلودگی اور ٹریفک سے طلبہ متاثر ہوتے ہیں۔ حکومت نے مطالبہ فوراً تسلیم کرلیا اور یہاں سڑک کے بجاے ڈیڑھ کلومیٹر کی سرنگ بنا دی گئی۔ محترم قاضی صاحب فرمانے لگے یہاں یہ عالم ہے اور ادھر پنجاب یونی ورسٹی جیسے عظیم ادارے کے طلبہ و طالبات کے لیے موجود چند پُلوں کو بھی مسمار کر دیا گیا ہے تاکہ گاڑیاں تیز رفتاری سے گزر سکیں۔

ناروے کے نظام' معاشرتی اقدار و روایات سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ امیر جماعت کے اس دورے سے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان روابط کی ایک مضبوط بنیاد رکھی گئی ہے۔

امریکی انتخاب اور مُسلم راے دہندگان

محمد ایوب منیر

نومبر ۲۰۰۴ء امریکا میں صدارتی انتخابات کا ماہ ہے۔ ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی انتہائی منظم انداز میں انتخابی مہم چلا رہی ہیں۔ ۷۰ لاکھ سے زائد مسلمان امریکا میں قیام پذیر ہیں۔ امریکی شہریت کے حامل اندازاً ۱۸ لاکھ مسلمان ووٹ ڈالنے کے اہل ہیں۔ مجموعی طور پر کل راے دہندگان کا یہ ۱۵ء۰ فی صد بنتے ہیں۔ ان راے دہندگان میں سے ایک تہائی وہ لوگ ہیں جنھیں پہلی مرتبہ رائے استعمال کرنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ اپنے سے ماقبل تارک وطن نسل سے زیادہ پُراعتماد، پُرجوش اور متحرک ہیں۔

فلوریڈا، مشی گن، اوھائیو، پنسلوانیا، ٹیکساس اور منی سوٹا کی ریاستوں کے ووٹ عموماً غیرمعمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ۱۱ستمبر کے واقعے کی گونج اب بھی سنائی دے رہی ہے، دہشت گردی کا تدارک بھی شہ سرخیوں کا موضوع ہے، تاہم ایک عام امریکی شہری متوازن بجٹ، اسلحہ کنٹرول، میڈیکل سہولیات، الکوحل، ٹیکس اصلاحات، نسلی امتیاز اور ووٹر رجسٹریشن جیسے مسائل کے حل میں دل چسپی رکھتا ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی امریکی فوج کے بیرونی کردار کو محدود کرنے، عظیم تر شہری آزادیوں اور اندرونِ ملک امور پر توجہ کے نعروں کو زیادہ متعارف کرا رہی ہے اور اس پارٹی کے امیدوار 'تہذیبی کش مکش' جیسے موضوع پر کم ہی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بوسٹن میں ہونے والے ڈیموکریٹک پارٹی کے کنونشن میں ۴۰ مسلمان نمایندے بھی شریک تھے۔ دوسری طرف ری پبلکن پارٹی ساری دنیا کو دہشت گردی سے پاک کرنے کی جدوجہد کا کریڈٹ لینا چاہتی ہے اور میڈیا و الیکشن منتظمین کے ذریعے اُس خطرناک صورت حال سے بچنا چاہتی ہے کہ جب پچھلی بار دونوں صدارتی اُمیدواروں کے ووٹ برابر برابر نکلے۔ تازہ ترین سروے نتائج کے مطابق جارج بش اکثریت حاصل کرسکتے ہیں۔

امریکا میں کام کرنے والے مختلف اداروں نے مسلم آبادی سے کئی سروے کیے، ان

اداروں میں مسلمانوں کی اپنی تنظیمات بھی شامل ہیں۔ سروے کے نتائج سے معلوم ہوا ہے کہ عرب آبادی جارج بش سے خصوصاً مشرقِ وسطیٰ پالیسی کی وجہ سے ناراض ہے۔ عرب آبادی میں ایک سروے سے معلوم ہوا کہ اسرائیل دوستی اور عرب دشمنی کی وجہ سے ۷۰ فی صد عرب ووٹر جارج بش کو ووٹ نہ دیں گے۔ اُنھوں نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ جارج بش کی پالیسی سے اظہار نفرت کے طور پر وہ جان کیری کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ برعظیم سے سابقہ تعلق رکھنے والے امریکی مسلمان بھی اپنے لائحہ عمل کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ جان کیری کے شہری آزادی' بنیادی حقوق اور امریکا کے داخلی جامع کردار کے موید ہیں اور انتخاب میں کیری کو کامیاب کرائیں گے۔ انتخابات سے عین پانچ ہفتے قبل تک جو سروے سامنے آرہے ہیں اُن میں جارج بش کا گراف مقامی امریکی آبادی میں بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے لیکن مسلمانوں نے ایسا کوئی مشترکہ اعلان نہیں کیا کہ وہ اپنی رائے میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ افغانستان وعراق پر بم باری ایسے امور پر امریکیوں کی بہت بڑی تعداد بش سے نالاں ہے اور وہ کسی بھی صورت میں ناراضی کے اظہار سے نہ رُکیں گے' چاہے جان کیری صدارتی انتخابات میں ناکام ہو جائے۔

سکونت پذیر امریکی مسلمانوں کے دو گروہ سب سے نمایاں ہیں۔ ان میں سے ۳۵ لاکھ عرب ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی درجنوں تنظیمیں اور سیاسی اختلافات ہیں اور مجموعی طور پر اتنی ہی تعداد برعظیم (پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش) سے تعلق رکھنے والوں کی ہے اور ان میں بھی غالب تر پاکستانی ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے قبل امریکا میں آبائی وطن چھوڑ کر سکونت اختیار کرنے والے مسلمان ''اچھا کھاؤ' اچھا پہنو'' کے جال میں مگن رہے۔ سیاسی' سماجی اور اقتصادی معاملات میں اُن کا کردار مغلوب رہا' تاہم ۱۹۸۰ء کے بعد جو نسل امریکا میں پیدا ہوئی ہے' اُس کو امریکا کے ساتھ ساتھ فلسطین' کشمیر' بوسنیا' الجزائر اور افغانستان سے بھی دل چسپی ایک حد تک ہے۔ وہ امریکا میں آئین وقانون کی پاسداری' نظامِ انتخابات اور بھرپور اظہارِ رائے کے ذریعے قومی امور میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ USA Patriot Act سے نالاں ہیں جس کے ذریعے ایک ایک فرد کے خاندانی حالات اور ذرائع آمدن کی انتہائی باریک تفصیلات بھی حکومت طلب کر سکتی ہے۔ خصوصاً یہ کہ آپ اپنی آمدن کن ممالک یا اداروں کو دیتے ہیں' تاکہ ''دہشت

گردی'' کے لیے معاشی وسائل کی فراہمی کا سدباب کیا جاسکے۔ ۱۱ستمبر کے واقعے کے بعد ۲۰۰۲ء میں ایک غیرسرکاری تنظیم کے سروے کے مطابق ۵۷ فی صد امریکی مسلمان ہراساں کیے گئے یا نسلی بنیادوں پر امتیازی سلوک کا شکار ہوئے۔ نئی نسل کی اسٹرے ٹیجی یہ ہے کہ تمام تر نسلی' لسانی' علاقائی اختلافات کے باوجود یک زبان ہوکر اپنی رائے کا اظہار کریں اور اپنے امریکا کو انصاف کا علم بردار ملک بنادیں۔ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ درست فیصلہ ہونے کی صورت میں بلدیاتی انتخابات اور سینیٹ و کانگرس میں نمایندگی کا مستحکم دروازہ کھل سکتا ہے۔

امریکن مسلم ٹاسک فورس آن سِول رائٹس اینڈ الیکشنز (AMT) کا قیام اس لحاظ سے خوش آیند ہے کہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم مسلم رائے دہندگان کے لیے اصولی رہنمائی فراہم کررہا ہے۔ اس فورم کے قیام کے پس منظر میں یہ نظریہ کارفرما ہے کہ مسلم آبادی کو قانونی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا پڑے گی' نیز ''تنہائی'' اور ''لاتعلقی'' کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اس مشترکہ پلیٹ فارم میں امریکن مسلم الائنس (AMA)' کونسل آف امریکن اسلامک ریلیشنز (CAIR)' پاکستانیوں کی معروف اور متحرک تنظیم اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا (ICNA)' مختلف ممالک کے مسلمانوں کا اتحاد اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA)' مسلم الائنس آف نارتھ امریکا (MANA)' مسلم امریکن سوسائٹی (MAS)' مسلم پبلک افیئرز کونسل (MPAC)' مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن-نیشنل (MSA-N)' اور پراجیکٹ اسلامک ہوپ (PIH) شامل ہیں۔

اس ٹاسک فورس کے قائم ہونے سے قبل عموماً یہ رائے پائی جاتی تھی کہ سینیٹ کے اُن امیدواروں کو ووٹ دیے جائیں جو علاقائی مسائل اور سیاسی قوانین کے بارے میں اُن کے لیے سودمند ثابت ہوں اور قانونی جنگ لڑ سکتے ہوں' جتھہ بن کر کسی پارٹی کے ساتھ منسلک نہ ہوا جائے جس طرح ۲۰۰۰ء کے انتخابات میں کیا گیا تھا اور مسلم ووٹروں نے ۴۵ فی صد رائے جارج ڈبلیو بش کے پلڑے میں ڈال دی تھی۔ بعدازاں اُس نے عراق و افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بھی بجائی اور داد و تحسین کا طلب گار بھی ہوا۔ ال گور کیونکہ مسلم کمیونٹی کے بڑے استقبالیوں میں یہود دوستی کی وجہ سے شریک نہ ہوا' اس لیے مسلم کمیونٹی نے اُس سے بالکل بے اعتنائی برتی۔

امریکا ٹاسک فورس نے سات نکاتی ایجنڈا متعارف کرایا ہے اور اپنی اجتماعی مہم کا نام

Civil Rights Plus رکھا ہے۔ اس کی وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ ''سب کے لیے شہری حقوق'' ایک اہم نکتہ ہے لیکن واحد نکتہ نہیں۔ تعلیم' رہایش کی عدم فراہمی' اقتصادی بحالی' ماحولیاتی وارضیاتی تحفظ' انتخابی اصلاحات' جرائم' امنِ عالم اور انصاف بھی توجہ کے بھرپور مستحق ہیں۔ فورس نے مسلمان آبادیوں سے گزارش کی ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں مختلف جماعتوں کے نمایندوں کو شہری حقوق اور مذکورہ بالا امور پر سابقہ کارکردگی کی روشنی میں پرکھیں اور اِن کے بارے میں تفصیلی رائے طے شدہ پرفارمے ٹاسک فورس کو فراہم کریں۔ فورس کی تاسیس میں شریک انجمنوں' اداروں اور پریشر گروپس سے کہا گیا ہے کہ اپنے ممبران کو مکمل طور پر متحرک کریں' نیز راے عامہ کے سروے' سوالناموں اور پالیسی سیمی ناروں کے ذریعے ووٹروں کی تربیت بھی کریں۔ علاوہ ازیں اس چیز کو یقینی بنائیں کہ ووٹ کے حق دار ۱۸ لاکھ مسلمان اپنے ضروری کاغذات مکمل کرائیں اور کوئی شخص بھی ووٹ نہ دینے کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔ علماے کرام نے امریکا کے مخصوص پس منظر میں فتویٰ بھی دے دیا ہے کہ ان حالات میں ووٹ نہ دینا کسی اور بڑے المیے کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا' بلاواسطہ یہ پیغام بھی ہے۔ منتخب کوئی بھی ہو اُمت مسلمہ' فلسطین اور کشمیر کو فراموش نہ کیا جائے۔

گذشتہ ۲۰۰ برسوں میں یہودی آبادی نے اپنی کم تعداد اور بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ نہ صرف اسلحہ مارکیٹ' پٹرول مارکیٹ اور بنک کاری پر قبضہ جمائے رکھا بلکہ اسرائیل کی بھی سرپرستی جاری و ساری رکھی' نیز قوت کے حصول پر خصوصی ارتکاز رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل فلسطینیوں پر ظلم بھی ڈھا رہا ہے' ۶۵۰ کلومیٹر طویل متنازعہ دیوار بھی تعمیر کر رہا ہے اور عالمی عدالت انصاف کے فیصلوں کو بھی بآسانی رد کر رہا ہے۔ اگلے ماہ ہونے والے انتخابات میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی آیا امریکی مسلمانوں نے ہم عصر یہودیوں سے کوئی سبق بھی سیکھا ہے یا نہیں!

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دو تہائی رات گزر جاتی تو اٹھ جاتے اور کہتے: لوگو! اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، قیامت آ گئی، محشر کی گھڑی آ گئی، موت اور موت کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے بہت قریب ہے، موت اور موت کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے بہت قریب ہے۔

(سنن ترمذی)

رسائل ومسائل

رمضان میں قیامِ اللیل

سوال: براہِ کرم مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں:

۱- علمائے کرام بالعموم یہ کہتے ہیں کہ تراویح اول وقت میں (عشاء کی نماز کے بعد متصل) پڑھنا افضل ہے اور تراویح کی جماعت سنت موکدہ کفایہ ہے، یعنی اگر کسی محلے میں تراویح یا جماعت نہ ادا کی جائے تو اہلِ محلہ گنہگار رہوں گے اور دو آدمیوں نے بھی مل کر مسجد میں تراویح پڑھ لی تو سب کے ذمے سے ترکِ جماعت کا گناہ ساقط ہوجائے گا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں کیوں، ایسا نہیں ہوا؟ اور اس زمانے کے مسلمانوں کے لیے کیا حکم ہوگا؟ کیا وہ سب تراویح باجماعت نہ پڑھنے کی وجہ سے گنہگار رہتے؟

۲- کیا نمازِ تراویح اول وقت میں سونے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے؟ کیا سحری کے وقت تراویح پڑھنے والا فضیلت واولیت سے محروم ہوجائے گا؟ اگر محروم ہوجائے گا تو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ

التی تنامون عنھا افضل من التی تقومون؟

۳- کیا رمضان میں نمازِ تہجد سے تراویح افضل ہے؟ اگر ایک آدمی رمضان میں عشاء پڑھ کر سو رہے اور تراویح پڑھے بغیر رات کو تہجد پڑھے (جب کہ تہجد کے لیے خود قرآن مجید میں صراحتاً ترغیب دلائی گئی ہے اور تراویح کو یہ مقام حاصل نہیں) تو

اس کے لیے کوئی گناہ تو لازم نہ آئے گا؟ واضح رہے کہ تراویح اور تہجد دونوں کو نبھانا مشکل ہے۔

۴- کیا تراویح کے بعد وتر بھی جماعت سے پڑھنے چاہییں؟ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تراویح سے پہلے وتر پڑھ لے اور رات کے آخری حصے میں تراویح ادا کرلے؟

۵- تراویح کی تعداد رکعت کیا ہے؟ کیا صحیح احادیث میں آٹھ، ۲۰، ۳۸ یا ۴۰ رکعتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں؟

۶- کیا کسی صحابی کو یہ حق حاصل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کو یہ کہہ کر رد کردیں کہ ماذال بکم التی رایت من صنیعکم خشیت ان یکتب علیکم ولو کتب علیکم ماقتم به فصلوا ایها الناس فی بیوتکم فان افضل صلوٰة المرء فی بیته الا الصلوٰة المکتوبة تو وہ اسے پھر باقاعدہ جماعت کے ساتھ مساجد میں جاری کرے؟

جواب: تراویح کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱- نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے زمانوں کی بہ نسبت رمضان کے زمانے میں قیامِ اللیل کے لیے زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آپؐ کو بہت محبوب تھی۔

۲- صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں تین رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی اور پھر یہ فرما کر اسے چھوڑ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہوجائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تراویح میں جماعت مسنون ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح فرض کے درجہ میں نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ ایک پسندیدہ سنت کے طور پر تراویح پڑھتے رہیں مگر بالکل فرض کی طرح لازم نہ سمجھ لیں۔

۳- تمام روایات کو جمع کرنے سے جو چیز حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جماعت کے ساتھ رمضان میں جو نماز پڑھائی وہ اول وقت

تھی نہ کہ آخر وقت میں۔ اور وہ آٹھ رکعتیں تھیں نہ کہ ۲۰ (اگرچہ ایک روایت ۲۰ کی بھی ہے مگر وہ آٹھ والی روایت کی بہ نسبت ضعیف ہے)۔ اور یہ کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد واپس جا کر اپنے طور پر مزید کچھ رکعتیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مزید رکعتیں کتنی ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں جو حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعتیں پڑھنے کا طریقہ رائج کیا اور تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ زائد رکعتیں ۱۲ ہوتی تھیں۔

۴- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانے تک باقاعدہ ایک جماعت میں سب لوگوں کے تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج نہ تھا، بلکہ لوگ یا تو اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے یا مسجد میں متفرق طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ اسی تفرق کو دُور کر کے سب لوگوں کو ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس یہ حجت موجود تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تین بار جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی تھی۔ اس لیے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے کو یہ فرما کر بند کیا تھا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گزر جانے کے بعد اس امر کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا کہ کسی کے فعل سے یہ چیز فرض قرار پا سکے گی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ایک سنت اور مندوب چیز کی حیثیت سے اس کو جاری کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے تفقہ کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے کہ انھوں نے شارع کے منشا کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور اُمت میں ایک صحیح طریقے کو رائج فرما دیا۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا اس پر اعتراض نہ کرنا، بلکہ بسروچشم اسے قبول کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ شارع کے اس منشا کو بھی ٹھیک ٹھیک پورا کیا گیا کہ "اسے فرض کے درجہ میں نہ کر دیا جائے"۔ چنانچہ کم از کم ایک بار تو ان کا خود تراویح میں شریک نہ ہونا ثابت ہے، جب کہ وہ عبدالرحمٰنؓ بن عبد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں لوگوں کو تراویح پڑھتے دیکھ کر اظہار تحسین فرمایا۔

۵- حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو باتفاق صحابہ ۲۰ رکعتیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کی پیروی حضرت عثمانؓ اور

حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی ہوئی۔ تینوں خلفا کا اس پر اتفاق اور پھر صحابہؓ کا اس میں اختلاف نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لوگ تراویح کی ۲۰ ہی رکعتوں کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تینوں ۲۰ ہی رکعت کے قائل ہیں' اور ایک قول امام مالکؒ کا بھی اسی کے حق میں ہے۔ داؤد ظاہریؒ نے بھی اسی کو سنت ثابتہ تسلیم کیا ہے۔

۶- حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت ابان بن عثمان نے ۲۰ کے بجاے ۳۶ رکعتیں پڑھنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی تحقیق خلفاے راشدین کی تحقیق کے خلاف تھی' بلکہ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ مکہ سے باہر کے لوگ ثواب میں اہلِ مکہ کے برابر ہوجائیں۔ اہلِ مکہ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ تراویح کی ہر چار رکعتوں کے بعد کعبے کا طواف کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہر طواف کے بدلے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ طریقہ چونکہ اہلِ مدینہ میں رائج تھا اور امام مالکؒ اہلِ مدینہ کے عمل کو سند سمجھتے تھے' اس لیے انھوں نے بعد میں ۲۰ کے بجاے ۳۶ کے حق میں فتویٰ دیا۔

۷- علما جس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ جس بستی یا محلے میں سرے سے نماز تراویح باجماعت ادا ہی نہ کی جائے اس کے سب لوگ گناہ گار ہیں' وہ یہ ہے کہ تراویح ایک سنت الاسلام ہے جو عہدِ خلافت راشدہ سے تمام اُمت میں جاری ہے۔ ایسے ایک اسلامی طریقے کو چھوڑ دینا اور بستی کے سارے ہی مسلمانوں کا مل کر چھوڑ دینا' دین سے ایک عام بے پروائی کی علامت ہے جس کو گوارا کرلیا جائے تو رفتہ رفتہ وہاں سے تمام اسلامی طریقوں کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس پر جو معارضہ آپ نے کیا ہے اس کا جواب اوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے۔

۸- اس امر میں اختلاف ہے کہ تراویح کے لیے افضل وقت کون سا ہے' عشاء کا وقت یا تہجد کا؟ دلائل دونوں کے حق میں ہیں' مگر زیادہ تر رجحان آخر وقت ہی کی طرف ہے۔ البتہ اول وقت کی ترجیح کے لیے یہ بات بہت وزنی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اول وقت ہی کی تراویح پڑھ سکتے ہیں۔ آخر وقت اختیار کرنے کی صورت میں اُمت کے سوادِ اعظم کا اس ثواب سے محروم رہ جانا ایک بڑا نقصان ہے۔ اور اگر چند صلحا آخر وقت کی فضیلت سے مستفید ہونے کی خاطر اول

وقت کی جماعت میں شریک نہ ہوں تو اس سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام الناس یا تو ان صلحا سے بدگمان ہوں، یا ان کی عدمِ شرکت کی وجہ سے خود ہی تراویح چھوڑ بیٹھیں۔ یا پھر ان صلحا کو اپنی تہجد خوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے پر مجبور ہونا پڑے۔ ھذا ما عندی والعلم عنداللّٰہ وھو اعلم بالصواب۔ (مولانا مودودیؒ، رسائل و مسائل، ج ۲، ص ۱۶۵-۱۶۹)

معاشرتی بگاڑ اور خواتین کا حصول تعلیم: ایک وضاحت

س: ''رسائل و مسائل'' (اگست ۲۰۰۴ء) میں ڈاکٹر انیس احمد صاحب نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے (ص ۹۵-۹۷) لکھا ہے کہ: ''ایک وقت آئے گا جب مخلوط تعلیمی اداروں میں بھی طلبہ و طالبات کو اپنے ''ایمان کی نشوونما'' میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور مخلوط تعلیم کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ اداروں میں professional ethics نافذ کیے جائیں۔ لیکن اگر ہم قرآن و سنت کی طرف رجوع کریں تو یہ بات صریحاً اور واضح طور پر ملتی ہے کہ نامحرم مرد اور نامحرم عورت اکٹھا نہیں ہو سکتے۔ اسلام میں عورت کو محرم کے بغیر گھر سے باہر نکلنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ایسے میں کیا مخلوط تعلیم جہالت کی علامت نہیں ہے؟ مگر ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اصل بات رویوں (attitudes) کی ہے۔ میں خود دو سال سے مخلوط تعلیم میں پڑھ رہا ہوں۔ کبھی بھی یہ ممکن نہیں کہ مخلوط تعلیم میں بھی وہ مرحلہ آئے کہ ''ایمان کی نشوونما'' ہو سکے اور ایک مثالی معاشرہ قائم ہو سکے۔

اگر مخلوط تعلیم حرام نہیں ہے تو کیا یہ مباح ہے یا مکروہ؟ براہِ مہربانی اس الجھن کی وضاحت کیجیے تاکہ ہم جو اِس مخلوط تعلیم کے سب سے بڑھ کر مخالف ہیں، اپنا ہدف قائم کرلیں کہ ہمیں مخلوط تعلیم ختم کرنی ہے یا پھر مخلوط اداروں میں ethics کو لاگو کرنا ہے؟

ج: آپ نے ''معاشرتی بگاڑ اور خواتین کا حصول تعلیم'' (اگست ۲۰۰۴ء) سے اختلاف کیا ہے جو ایک صحت مند روایت ہے۔ لیکن حوالہ دیتے وقت نہ سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھا ہے

اور نہ ہی امانتِ تحریر کو سامنے رکھتے ہوئے الفاظ کو صحیح طور پر نقل کیا ہے۔ براہِ کرم دوبارہ جواب کا مطالعہ فرمائیں اور تلاش کریں کہ آپ نے جو الفاظ جواب سے منسوب کیے ہیں یعنی ''ایک وقت آئے گا جب مخلوط تعلیمی اداروں میں بھی طلبہ و طالبات کو اپنے ایمان کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی' یا ''مخلوط تعلیم کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا'' جواب میں کس جگہ استعمال کیے گئے ہیں۔ الفاظ کو سیاق و سباق سے جدا کر کے آپ جو مفہوم نکالنا چاہتے ہوں' اس کے لیے آپ آزاد ہیں لیکن کسی دوسرے کو quote کرنے کے آداب کا خیال ضرور رکھیں۔ ایسا نہ کرنا اسلامی رویے کے منافی ہے۔

جو بات جواب میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عبوری دور میں جب آپ کے پاس الگ الگ تدریسی ادارے نہ ہوں کیا کیا جائے؟ کیا جب تک طالبات کے لیے الگ میڈیکل کالج نہ ہوں' ان کے لیے میڈیکل تعلیم کا حصول ممنوع کر دیا جائے؟ یا حتی الامکان یہ کوشش کی جائے' اس عبوری دور میں ان کے اخلاق و عمل کو اسلامی تعلیمات سے مزین کیا جائے اور اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے رویے کو متاثر کیا جائے۔

اگر ایک فرد میں حق کی طلب ہو یا حق کی طلب پیدا کر دی جائے تو ایک مخلوط اور ناموافق ماحول میں بھی ہر لمحے ایمان میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ جو لوگ تندیِ بادِ مخالف سے گھبراتے ہیں اور بہتے ہوئے پانی کے ساتھ بہنے ہی میں اپنی سالمیت سمجھتے ہیں وہ کبھی بلندیوں کی طرف پرواز نہیں کر سکتے۔ بلاشبہہ تحریکاتِ اسلامی کے اہداف میں یہ بات شامل ہے اور انھیں اس پر فخر ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کی جگہ جداگانہ تعلیم کے نظام کو رائج کرنا چاہتی ہیں اور ان سے وابستہ افراد جہاں بھی ہیں اس ہدف کے حصول کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں لیکن جب تک ایسے ادارے وجود میں نہ آئیں' نامساعد حالات کے باوجود تعلیم کا سفر جاری رکھنا ہوگا۔ اگر کسی مقام پر مسجد نہ ہو تو کیا اہلِ ایمان نماز پڑھنا مؤخر کر دیں گے یا مسجد کی تعمیر کی جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ نماز بھی ادا کرتے رہیں گے۔

مجھے آپ کی اس بات سے قطعاً اتفاق نہیں ہے کہ اسلامی اخلاقی تعلیمات' یعنی قرآن وسنت کی تعلیمات کا ایسے ماحول میں نافذ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس ملک عزیز کی نصف صدی سے

زیادہ عمر میں ہمارے اکثر میڈیکل کالج مخلوط تعلیم پر چل رہے ہیں اور اسی ماحول میں اس ملک کی بیٹیوں نے اسلامی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل کرتے ہوئے ایم بی بی ایس کیا ہے اور ایسے ہی بے شمار طلبہ نے اخلاق، جہاد اور پاکیزگی کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔ ایسے اساتذہ بھی آج زندہ موجود ہیں جو اسلامی اخلاق و آداب کے ساتھ میڈیکل کالجوں میں تدریس کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ راولپنڈی کے ایک معروف طبی کالج میں بعض معلمات حجاب کے ساتھ طب کی تعلیم دیتی ہیں، جب کہ طالبات کے لیے اسکارف کا استعمال لازمی ہے۔ اخلاقی ضابطے کے نفاذ کے لیے ایمان و یقین کے ساتھ عزم کی ضرورت ہے اور یہ ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مطلوبہ منزل جداگانہ تعلیم ہی ہے اور رہے گی۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

کتاب نما

The History of the Qura'anic Text from Revelation to Compilation: A Comparative Study with Old and New Testaments [وحی سے تدوین تک قرآنی متن کی تاریخ' عہد نامہ جدید اور عہد نامہ عتیق سے تقابلی جائزہ]۔ مصنف: محمد مصطفیٰ الاعظمی۔ ناشر: اسلامک اکیڈمی' لسٹر برطانیہ۔ صفحات: ۳۷۶۔ قیمت: درج نہیں۔

اسلام ابتدا ہی سے مستشرقین کے علمی حملوں کی زد میں رہا ہے۔ انھوں نے اسلام کو عیسائیت اور یہودیت کی ایک مسخ شدہ شکل ثابت کرنے کی بڑی کوششیں کی ہیں۔ ابھی تک تو بات حدیث کی صحت اور سند تک تھی' اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ قرآن کا متن بھی مستند نہیں ہے اور عہد نامہ قدیم و جدید کی طرح قرآن بھی بعد میں مرتب کیا گیا ہے۔ آرتھر جیفرے اور ایک پورے گروہ نے اپنی دانست میں بڑی 'علمی تحقیقات' کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن دوسری تیسری صدی کا ایک من گھڑت افسانہ (نعوذ باللہ) ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی موضوع پر ایک ہندستانی اہلِ علم مصطفیٰ الاعظمی کی تصنیف ہے۔ یہ دیوبند اور جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں۔ انھیں شاہ فیصل ایوارڈ بھی ملا ہے (۱۹۸۰ء)۔ ان کی یہ تصنیف گہری تحقیق پر مبنی ہے جس میں اب تک اسلام پر کیے گئے حملوں کا' دستاویزات کی بنیاد پر موثر دفاع کیا گیا ہے۔ مصنف کو کتاب کی تحریک ماہنامہ اٹلانٹک کے مشہور مضمون ''قرآن کیا ہے؟'' (۱۹۹۹ء) سے ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب میں مغرب کے تعصبات' دُہرے معیارات' دیدہ دلیری اور بعض اوقات صہیونی اثرات کے بارے میں اپنا مؤقف مضبوطی اور محنت و کاوش سے پیش کرنے کے بعد عہد نامۂ عتیق (ص ۲۱۱ تا ۲۶۱) اور عہد نامہ جدید (ص ۲۶۵ تا ۲۹۸) کے

مختلف حصوں کے عکس بھی دیے ہیں اور ان کی تحریف کو ثابت کیا ہے۔ انھوں نے ۶۴ صحابہ کرامؓ کی فہرست دی ہے جنھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ بطور کاتب کام کیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس بات پر یقین نہیں کرتے کہ استنبول اور تاشقند کے نسخے وہی ہیں جنھیں حضرت عثمانؓ نے پھیلایا تھا۔

الاعظمی کو اس حقیقت کا ادراک ہے کہ بائبل کا بھی اسی معیار پر جائزہ لیا جائے تو حضرت موسٰیؑ اور حضرت عیسٰیؑ کے وجود ہی سے انکار کرنا پڑے گا' اور یہ عہدنامے گم نام قصے کہانیاں معلوم ہوں گے۔ یہ مذاق کی بات نہیں کہ یہودیت اور عیسائیت کا تقابل قرآن کے اڑھائی لاکھ نسخوں اور عہد رسالتؐ کے لاکھوں حفاظِ کرام سے کیا جائے جو علاقائی لب و لہجے کے اختلاف کے علاوہ ایک ہی متن پڑھتے رہے۔ اس کا موازنہ اس حقیقت سے کیجیے کہ دوبارہ منظرعام پر آنے سے قبل تورات یہودی علمی تاریخ سے آٹھ صدیاں غائب رہی۔ اس کا کوئی مستند متن موجود نہیں اور یہ کہ عہدنامۂ عتیق کا عبرانی زبان میں جو مکمل مسودہ سامنے آیا وہ ۱۰۰۸ عیسوی کا ہے۔

مصنف کو بخوبی علم ہے کہ ہر طرح کے علمی شواہد کے باوجود' مستشرقین مسلمانوں کے عقائد کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے رہیں گے اور وہ اپنے اس موہوم خیال کو حقیقت بنا کر پیش کرنا بند نہیں کریں گے کہ قرآن نبی کریمؐ کی وفات کے ۱۵ برس بعد یکجا کیا گیا اور لکھا گیا۔ ان کا یہی مؤقف رہے گا کہ قدیم عربی رسم الخط ناکافی تھا اور قرآن ۱۰۰ سال تک زبانی روایت رہا۔

بہرحال الاعظمی کی یہ کتاب اہم ہے اور امید ہے کہ وہ تمام مسلمان کو جو دعوہ سے متعلق ہیں اور علم و تحقیق سے وابستہ ہیں' اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (مراد ہوف مین' ترجمہ و تلخیص: عبداللہ شاہ ہاشمی۔ مسلم ورلڈ بک ریویو ۲۰۰۴ء)

قرآنی معجزات اور جدید سائنس' راجا عبداللہ نیاز۔ ناشر: مثال پبلشنگ' ۲۲-اے' حبیب بلڈنگ' چوک اُردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۷۴۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

راجا عبداللہ نیاز (۱۸۹۵ء-۱۹۷۱ء) لیّہ کے رہنے والے تھے۔ ساری عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ مطالعے کے رسیا اور شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ متعدد تصانیف نظم و نثر

(خدا اور اس کے رسول، یہ ہیں کارنامے رسولؐ خدا کے، صبحِ سخن) چھپ چکی ہیں مگر بہت سا تحریری کام غیر مطبوعہ ہے اور کچھ گم یا ضائع بھی ہوگیا۔ زیرنظر کتاب پروفیسر جعفر بلوچ کی سعی و کاوش سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب کے ایک حصے میں خوارق' انبیا بہ شمول اور رسول اکرمؐ کے بعض معجزوں' نیز انسانی مشاہدے میں آنے والے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات' مثلاً: مُردے ہم کلام ہوتے ہیں' خوابوں میں سچّی پیش گوئیوں اور ایسی باتوں کا تذکرہ ہے جن سے قوانینِ فطرت ٹوٹتے اور بدلتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مصنف نے اخبارات' رسائل اور انگریزی کتابوں کے بکثرت حوالے دیے ہیں۔

ایک حصے میں قرآنِ حکیم کے معجزات کا ذکر ہے۔ (حفاظتِ قرآن' آیاتِ قرآنی میں شفا کی تاثیر' قرآن ایک بے مثال ادب پارہ' قرآنی نکات اور جدید سائنسی اکتشافات و ایجادات وغیرہ)۔ اس حصے میں مصنف نے قرآن اور فلسفۂ اخلاقیات' اسی طرح اسلامی عبادت کی انفرادیت اور پھر قرآنی پیش گوئیاں جیسے عنوانات کے تحت بھی دل چسپ واقعات بیان کیے ہیں۔

جناب احمد جاوید نے اپنے فاضلانہ دیباچے میں کہا ہے کہ کتاب کا بیشتر حصہ سائنس کے اور دینی مزعومات کے رد پر مشتمل ہے۔ مصنف نے معجزات' کرامات اور دیگر خوارق کی تسلیم شدہ مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی سعیِ محمود کی ہے کہ کائنات' سائنس کے تصورِ اسباب و علل کی بنیاد پر نہیں بلکہ مشیتِ الٰہیہ پر چل رہی ہے۔

اگرچہ کتاب کی تدوین ٹھیک طرح سے نہیں ہوسکی لیکن جملہ مباحث بہت دل چسپ اور مصنف کی علمیت اور وسیع مطالعے کے آئینہ دار ہیں۔ (رفیع الدین ہاشمی)

A Strife between Religion and Politics in Abbasi Period [عہد عباسی میں معرکۂ دین و سیاست]' نعیم صدیقی' مترجم: ڈاکٹر مقبول الٰہی۔ ناشر: الفیصل ناشران' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۰۹۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

بقول مصنف ہمیں ''ایسے فنِ تاریخ نگاری کی ضرورت ہے جو ہمیں اپنے آپ کو جاننے

پہچاننے میں مدد دے''۔ چنانچہ یہ کتاب ہمیں خود احتسابی کی دعوت دیتی ہے۔ اولین طور پر یہ اُردو زبان میں معرکۂ دین و سیاست کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

مصنف نے خلافتِ عباسیہ کا عمومی جائزہ لیا ہے۔ خلافت کی بادشاہت میں تبدیلی سے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے بظاہر ''خلفا'' مگر اصل میں شاہانِ عباسیہ کے کردار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس دور میں کیے گئے تشدد اور ظلم و زیادتی پر مبنی اقدامات نہ اسلام کی نمایندگی کرتے ہیں نہ مسلمانوں کی، یہ بادشاہوں کے اپنے ذاتی فیصلے تھے۔ ''فوج کی سیاسی مداخلت'' ایک اہم باب ہے جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم نسلوں بعد بھی وہی غلطیاں دُہرا رہے ہیں۔ اسلامی خزانے میں ہونے والی خرد برد اور ایسے واقعات کی نشان دہی کی ہے جو اسلامی تاریخ و ثقافت کے چہرے پر دھبے ہیں۔ حکومت کا محکمہ قضا اور عدلیہ بھی دل چسپ واقعات سے پُر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ نامور علما، صلحا اور قضات نے جبر اور لالچ کو خاطر میں لائے بغیر ہمیشہ حق گوئی اور عدل و انصاف کا علم تھامے رکھا۔ آخری باب میں امام ابوحنیفہؒ کے انقلابی تصورات اور کارناموں کے ضمن میں درباری علما کے فتنۂ خلقِ قرآن اور فتنۂ اعتزال پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ڈاکٹر مقبول الٰہی نے ایک علمی کتاب کو انگریزی میں ڈھالنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ مترجم خود بھی ایک فاضل شخصیت اور ادیب ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نعیم صاحب کی شستہ اور ادیبانہ زبان اور شاعرانہ جملوں کا مفہوم کامیابی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور اچھے کاغذ پر، خوب صورت سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ تاریخ، عدلیہ، آزادیِ راے اور اسلامی انقلاب کے لیے کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ (محمد ایوب منیر)

صبحِ نو، راجا ذاکر خان۔ ناشر: ۶- طارق سنٹر، کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۱۴۰ روپے۔

اُمت مسلمہ مصائب و آلام اور مظلومیت کی زندگی گزار رہی ہے لیکن اپنے مسائل کی حقیقی

نوعیت سے بے خبر ہے اور نہیں جانتی کہ ان کا حل کیسے نکل سکتا ہے۔ زیرنظر کتاب میں اُمت کے ایک بہت اہم اور سلگتے ہوئے مسئلے اور مشرقِ وسطیٰ کے ناسور فلسطین کی نوعیت' پس منظر اور پیش منظر کو واضح کیا گیا ہے۔

بقول عبدالرشید ترابی: پاکستان میں مسئلہ فلسطین کو اجاگر کرنے کے لیے ذاکر خان نے بہت بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ وہ دردِ دل رکھنے والے ایک نوجوان قلم کار ہیں۔ انھوں نے مسئلہ فلسطین کی نوعیت' حماس اور پی ایل او کی جدوجہد' انتفاضہ' جہادِ فلسطین میں خواتین کے کردار' مہاجر کیمپوں اور اسرائیلی جیلوں میں بے گناہ فلسطینیوں پر بے پناہ مظالم اور ان کی حالت زار پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی حقوق اور معاہدات کے حوالے سے مغرب اور امریکا کا کردار کیا ہے اور عالمی صہیونی تحریک اور موساد' بھارت کی مدد سے مسلم ممالک کو ختم کرنے کے کیا منصوبے رکھتی ہے؟ کتاب اپنے موضوع پر جامع ہے اور مسئلہ فلسطین پورے سیاق وسباق کے ساتھ اُجاگر ہو جاتا ہے۔ (ع - ش - ہ)

حرمتِ سود' ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا' مترجم: مظفر قریشی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۹۴۔ قیمت: ۴۵ روپے۔

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا گذشتہ ۳۰ برس سے اسلامی معاشیات اور اسلامی بنک کاری پر گراں قدر کام سرانجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے عرصۂ دراز تک پاکستان کے مختلف اداروں کے علاوہ سعودی عریبین مانٹیری ایجنسی اور اسلامی ترقیاتی بنک کے ادارے اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بطور مشیر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس دوران میں انھوں نے ۱۲ کتب اور ۸۱ مقالے تحریر کیے۔

زیرتبصرہ کتاب مصنف کے تین انگریزی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معاشی زندگی کے بعض سلگتے مسائل پر بحث کی ہے۔ ایک شعوری مسلمان ان سوالات کے مدلل جوابات کا طالب ہوتا ہے' مثلاً: کیا اسلام نے واقعی سود کو حرام قرار دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی کیا وجوہ ہیں؟ حرمتِ سود کے پیچھے کیا حکمتِ کارفرما ہے؟ مزید برآں کیا سود کے بغیر بنک کاری کا نظام ممکن ہے؟

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا نے حرمتِ سود کی حکمتوں اور مصلحتوں پر نئے انداز سے تحقیق کے ذریعے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ انھوں نے ربا اور سود کے درمیان لفظی خلطِ مبحث کی بنیاد پر بعض لوگوں کی طرف سے پیدا کیے گئے فرق کو قوی دلائل سے رد کیا ہے۔ اسی طرح ربا النسیہ اور ربا الفضل کے بارے میں پیدا کی گئی الجھنوں کا شافی جواب دیا ہے۔

غیرسودی بنک کاری کے بارے میں کچھ لوگ تو سنجیدگی سے کچھ سوالات اٹھاتے ہیں مگر بعض لوگ بلاوجہ ہی اشتباہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخلاقی انحطاط کی وجہ سے اسلامی بنک کاری ممکن نہ ہوگی؟ اس اہم سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جدید بنک کاری کے تجربات کی بنیاد پر کئی عملی تجاویز دی ہیں جن کے ذریعے اس مسئلے پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی بنک کاری کے ضمن میں ہونے والی کامیابیوں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی بنک کاری کی راہ میں حائل مشکلات کا حل بھی تجویز کیا گیا ہے۔ مزید برآں ہر باب کے اختتام پر حواشی اور مصادر دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب اسلامی معاشیات اور اسلامی بنک کاری کے موضوع پر اردو زبان میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ (پروفیسر میاں محمد اکرم)

سفرنامہ محبوبیہ، ابوالامتیاز ع، س، مسلم۔ ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۵۲۔ قیمت: ۲۷۰ روپے۔

سفرنامہ محبوبیہ بلاد اسلامیہ (ترکی، شام، مصر، لبنان، اردن، دبئی اور حجاز) کے اسفار پر مشتمل ہے۔ مصنف ایک راست فکر دانش ور، بلند پایہ انشاپرداز، عمدہ شاعر اور صاحبِ اسلوب قلم کار ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی وسعت کے سبب ان کے ہاں ایسی بصیرت ملتی ہے جو دیگر سفرنگاروں میں کم کم پائی جاتی ہے۔

سفرنامے کے مصنف نے ۱۷، ۱۸ سال عرب امارات میں بسر کیے اور ان ممالک کے بیسیوں نہیں دوسو بار سفر کیے۔ گردوپیش اور وہاں کے ماحول اور معاشروں میں جذب ہوکر ان کا مطالعہ اور تجزیہ کیا، تاریخ کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ تاریخ کو بنتے بگڑتے دیکھا۔ معاشرت کی

جھلکیاں بار بار سامنے آتی ہیں۔ مصنف کا ماٹو ہے کہ سفر' علم وعمل اور عرفان وآگہی کی عملی درس گاہ ہے۔اس لیے ان کا یہ سفرنامہ فکرونظر کے نئے دریچے کھولتا ہے۔ نامور کالم نگار عرفان صدیقی کے بقول: ''یہ بالکل ہی منفرد انداز واسلوب کا سفرنامہ ہے جس میں مسافر یا سیاح محض گردوپیش کے مناظر' تہذیب و معاشرت کے رنگ ڈھنگ' افراد کے انداز و اطوار' قابلِ دید مقامات کی سج دھج...... ذاتی تجربات و مشاہدات ہی کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ ٹھوس افکار اور سنجیدہ مباحث کا دبستان کھول دیتا ہے''۔

پیش لفظ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے قلم سے ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔ تصاویر بھی شامل ہیں۔ص ۳۴ کی پہلی تصویر ایا صوفیا کی ہے' نہ کہ مسجد سلیمانیہ کی۔ (ع - ش - ہ)

تعارف کتب

☆ Holy Quran [قرآنِ مقدّس]' مترجم: (کرنل) محمد ایوب خاں۔ ناشر: ہولی قرآن سوسائٹی' ۲۹۴' توسیع' کیولری گراؤنڈ' لاہور کینٹ۔ صفحات: ۴۸۸۔ قیمت: درج نہیں۔ [قرآن پاک کا سادہ انگریزی ترجمہ۔ مترجم کی تجویز ہے کہ بیرونِ ملک جانے والے یہ ترجمہ قرآن مترجم سے حاصل کریں اور انگریزی خواں قارئین تک پہنچائیں۔]

☆ عہد رواں کی ایک عبقری شخصیت (علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی)' مولانا محمد امین نورانی۔ ناشر: بزم انوار القرآن' مدنی مسجد' گلشن اقبال' بلاک ۵' کراچی۔ صفحات: ۲۸۸۔ قیمت: درج نہیں۔ [مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی زندگی اور ان کے علمی' دینی' سیاسی اور تبلیغی کارناموں کا ایک جامع مرقّع۔ مولانا مرحوم کی متعدد تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔]

☆ موضوعاتی اشاریہ' السیرہ و نعت رنگ' مرتب: حافظ سید محمد اظہر سعید۔ ناشر: سیرت اکادمی بلوچستان' ۲۷۲-اے' او بلاک III' سیٹلائٹ ٹاؤن' کوئٹہ۔ صفحات: ۶۰۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ [سیرت کے دو رسائل السیرہ عالمی' ششماہی'' اور نعت رنگ (شمارہ ۱تا۱۲) میں شائع ہونے والے مضامین' نعتوں' تبصروں وغیرہ کا اشاریہ۔ اس موضوع سے دل چسپی رکھنے اور اس پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک مفید راہ نما۔]

☆ کاروانِ خیال' مرتب: گوہر ملسیانی۔ ناشر: ادارہ عکسِ صادق' مظہر فرید کالونی' صادق آباد۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۸۱ روپے۔ [رحیم یار خان کے آٹھ شعرا کا تعارف اور ان کا کلام' جن کی تصاویر سرورق اور پشت پر دی گئی ہیں۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لیے تحفہ۔]

☆ **نورِ ہدایت**‘ ڈاکٹر شگفتہ نقوی۔ ناشر: مکتبہ خواتین میگزین‘ کیمرہ مارکیٹ‘ ۴۲- چیمبرلین روڈ‘ لاہور۔ صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۱۲۰۔ بیرون ملک: ۵ ڈالر۔ [قرآن پاک کی بعض منتخب آیاتِ محکمات کا ترجمہ۔ مفہوم تفاسیر کے بغیر بھی بآسانی سمجھ آجاتا ہے۔ عام قاری کے لیے مفید‘ البتہ ترجمے کے ساتھ قرآن کا متن بھی دیا جاتا تو اہمیت دوچند ہوجاتی۔]

اعتذار: کرنل محمد ایوب خاں کی تصنیف **علم و ہدایت** کے تعارف (اگست ۲۰۰۴ء) میں قیمت ۱۰ روپے درج ہوگئی تھی۔ تصحیح کر لیجیے کہ اصل قیمت ۱۰۰ روپے ہے۔

ہم نے آج تراویح میں کیا پڑھا؟ (اُردو/سندھی) تراویح کے دوران روزانہ پڑھے جانے والے قرآن کریم کے حصے کا خلاصہ اور قرآنی و مسنون دعائیں مع آسان ترجمہ۔ 6 روپے کے ڈاک ٹکٹ ڈاکٹر ممتاز عمر T-475 کورنگی نمبر ۲ کراچی-74900 کے پتے پر روانہ کر کے کتابچے حاصل کر سکتے ہیں۔ نابینا افراد آڈیو کیسٹ کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں۔

مدیر کے نام

مراد لعل 'چترال۔ملک محمد حسین 'لاہور

''مغربی تہذیب کی یلغار'' (ستمبر۲۰۰۴ء) میں مغرب کی اسلام کے خلاف سازشوں کو بخوبی بے نقاب کیا گیا ہے اور مقابلے کے لیے حکمت عملی اور لائحہ عمل بھی دیا گیا ہے جس کے دوررس اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔

مضمون میں جہاں مسلمانوں کے لیے فکروتدبر کے کئی زاویے ہیں وہاں مغربی' خصوصاً امریکی عوام و خواص کے لیے غوروفکر کے متعدد نکات ہیں کہ اگر وہ انھیں سمجھ لیں تو بین الاقوامی تعلقات خصوصاً مسلم۔مغرب تعلقات میں خوش گوار تبدیلی آسکتی ہے۔اس مضمون کو انگریزی زبان میں منتقل کر کے وسیع پیمانے پر اشاعت کی ضرورت ہے۔

حیات الرحمٰن 'ایبٹ آباد۔محمدعاصم'سرائے عالم گیر

''تعلیم کا استعماری ایجنڈا اور آغا خان بورڈ'' (ستمبر۲۰۰۴ء) نہایت اہم اور فکرانگیز مضمون ہے۔ مستقبل سے بے نیاز حکمرانوں کو یقیناً اس بارے میں سوچنا چاہیے۔پارٹی تعصبات کو بالاے طاق رکھتے ہوئے تمام ارکانِ پارلیمنٹ کو اس مسئلے کے خلاف مثبت قدم اٹھانا چاہیے وگرنہ آیندہ نسلیں ایسے موقع پرست حکمرانوں اور سیاست دانوں کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

ملک محمد حسین 'لاہور

آغا خان امتحانی بورڈ کے اثرات اور نتائج پر بڑی بالغ نظری کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن آغا خان امتحانی بورڈ کی گاڑی اب اتنی دور جاچکی ہے کہ اُسے پیچھے ہٹانا اب شاید ممکن نہیں رہا۔

آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ کا آرڈی ننس نومبر۲۰۰۲ء میں نافذ ہوا اور اسے ۱۷ویں آئینی ترمیم میں تحفظ بھی مل چکا۔اس لیے یہ سب کچھ بعد از مرگ واویلا کی بات ہے۔نواز شریف کی حکومت میں منظور کی جانے والی ۱۹۹۸ء کی ایجوکیشن پالیسی کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔آغا خان یونی ورسٹی نے امتحانی بورڈ کے لیے درخواست بھی ۱۹۹۹ء میں دی تھی۔قومی سوچ رکھنے والی قوتوں نے اس طرف توجہ نہ دی اور اب' جب کہ بیج درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے تو واویلا کرنے کا کیا فائدہ۔اب تو جو کچھ ممکن ہے وہ یہ ہے کہ: ۱- آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ کو پابند کیا جائے کہ وہ قومی نصابِ تعلیم کے مطابق امتحان لے۔ ۲- آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ' انٹر بورڈ کمیٹی آف چیئرمین (IBCC) جو وفاقی وزارتِ تعلیم کا سپروائزری ادارہ ہے کی چھتری کے

تحت کام کرے اور انھی قوانین وضوابط کی پابندی کرے جن کی تمام قومی امتحانی بورڈز پابندی کرتے ہیں۔
۳- انٹر بورڈ کمیٹی آف چیئرمین کا درجہ بڑھایا جائے اور اسے ریگولیٹری اتھارٹی کا درجہ دیا جائے اور اسے تمام قومی تعلیمی بورڈ بشمول آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ کو ریگولیٹ کرنے کا اختیار دیا جائے۔

آسی ضیائی، لاہور۔ محمد افضل خان ایڈووکیٹ، مانسہرہ

''ہر فرعونے را موسیٰ، ہر کمالے را زوال'' (ستمبر ۲۰۰۴ء) میں برطانیہ کے بادشاہ لوئی چہاردہم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف سے سہوِ قلم ہوگیا ہے۔ برطانیہ کی پوری تاریخ میں نہ تو لوئی نام کا کوئی بادشاہ گزرا ہے، اور نہ ان برطانوی بادشاہوں میں ایک ہی نام کے آٹھ سے زیادہ بادشاہ ہوئے ہیں۔ درحقیقت لوئی چہاردہم فرانس کا حکمراں تھا، اور اسی کی طرف یہ جملہ منسوب ہے: I am the state

نصیر خان، نوشہرہ

''تصنیفی تربیت کا ایک تجربہ'' (ستمبر ۲۰۰۴ء) پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ چلو ۴۰ سال بعد سہی، ادارہ معارف اسلامی لاہور نے آخر کار کم از کم اپنا پہلا قدم تو اٹھا ہی لیا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق، کراچی

ترجمان القرآن کی آیندہ پالیسی اور ہدف یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کو امریکی اثر ونفوذ سے کیسے آزاد کرایا جائے؟ جمہوریت کو فوج اور ایجنسیوں کی مداخلت سے کیسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے تاکہ حقیقی شورائیت کی بنیاد پر ملک کو صحیح قیادت مل سکے؟ صاف اور شفاف انتخابات کے لیے قانونی اور انتظامی امور پر موجودہ نظام میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

ان موضوعات پر مفکرین و محققین سے خصوصی طور پر مقالے لکھوائے جائیں، اسٹڈی سرکلز کا انعقاد ہو، مختلف جامعات کے اساتذہ کو بلا کر ورکشاپ ہو اور آیندہ کے لیے قلیل المدت اور طویل المدت منصوبہ کار قوم کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس وقت کسی حد تک تاثر ابھرتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وقتی ضرورتوں کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں امریکی استعمار پاکستان میں مزید طاقتور ہو رہا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی، لاہور

ترجمان میں شائع ہونے والی تحریریں فطری اور علمی اعتبار سے بامعنی اور پُرافادیت ہوتی ہیں اور پرچے کا صوری حسن بھی اطمینان بخش اور لفظی و املائی صحت بھی قابلِ داد--- مگر ستمبر کے شمارے میں صحتِ املا سے غفلت نمایاں ہے، مثلاً: ھدیہ (ہدیہ)، بھروسہ (بھروسا)، سائے (سایے)، چھ (چھے) وغیرہ--- یہ صحت املا کے اصولوں کی خلاف ورزی یا لاپروائی کیوں؟ ان اصولوں سے اشتہاروں کی عبارات کیوں مستثنیٰ ہیں؟


SINCE 1979
SUNDIP
نورس قومی مشروب
JAMS, JELLIES,
KETCHUP
CHUTNIES &
PICKLES
SUNDIP
Halal
TOMATO
Ketchup
550g
Net Weight
SUNDIP
MIXED
Pickle in O
SUNDIP
SUNDIP
Apple Jam
نورس
NATIONAL DRINK

ملّت کی خدمت کیلئے | صلاحیتوں میں نکھار کیلئے | شخصیت کی تعمیر کیلئے | روشن مستقبل کیلئے

جامعہ اسلامیہ جدیدہ

فیصل ٹاؤن

وہاڑی

رابطۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان کے ساتھ الحاق شدہ

سرپرست: شیخ القرآن والحدیث حضرت
مولانا عبدالمالک مدظلہ' ایم این اے

صدر: امیر جماعت اسلامی ضلع وہاڑی
چودھری محمد طفیل وڑائچ

جماعت اسلامی کا مثالی تعلیمی، تربیتی اور اقامتی ادارہ

- اپنی اور اپنی اولاد کی عاقبت سنوارنے کے لیے اُنھیں نظریاتی کارکن / علمائے دین بنانے کی فکر کیجیے۔
- جامعہ کا مقصد اعلیٰ سیرت وکردار کے حامل ایسے نوجوان علمائے دین تیار کرنا ہے جو کہ اسلامی علوم کے مستند ماہرین ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر بھی دسترس رکھتے ہوں اور فراغت کے بعد ملک وقوم کی خدمت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔
- پرائمری کے بعد گیارہ سالہ اور مڈل کے بعد آٹھ سالہ نصاب تعلیم' ایم اے عربی / اسلامیات کے مساوی فاضل درس نظامی اور دورہ حدیث کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مروجہ جدید تعلیم۔
- طلبہ کی تعمیر سیرت وکردار کے لیے تعصب سے پاک بہترین ماحول۔
- تمام طلبہ کے لیے مفت تعلیم اور طبی سہولیات جب کہ مستحق اور یتیم طلبہ کے لیے قیام وطعام' لباس اور کتب کی فری سہولیات۔

اعلانِ داخلہ

ایم ۔ اے عربی / اسلامیات کے مساوی فاضل درسِ نظامی / دورۂ حدیث کے مکمل آٹھ سالہ کورس (میٹرک لازمی' جب کہ ایف اے' بی اے اختیاری) کے سال اوّل میں داخلہ 10 تا 20 شوال ہوگا۔

خواہش مند والدین فوری رجوع فرمائیں

ضرورت اساتذہ

مڈل اور میٹرک سٹینڈرڈ کے لیے تعلیمی قابلیت: انگریزی (ایم اے)' ریاضی (بی ایس سی' ڈبل میتھ)' کمپیوٹر (پی جی ڈی) اور درجہ حفظ (تجربہ کار قاری)۔ تحریکی اور نظریاتی تجربہ کار اساتذہ اپنی درخواستیں ہمراہ نقول اسناد و شناختی کارڈ' 20 اکتوبر 2004ء تک ارسال فرمائیں۔

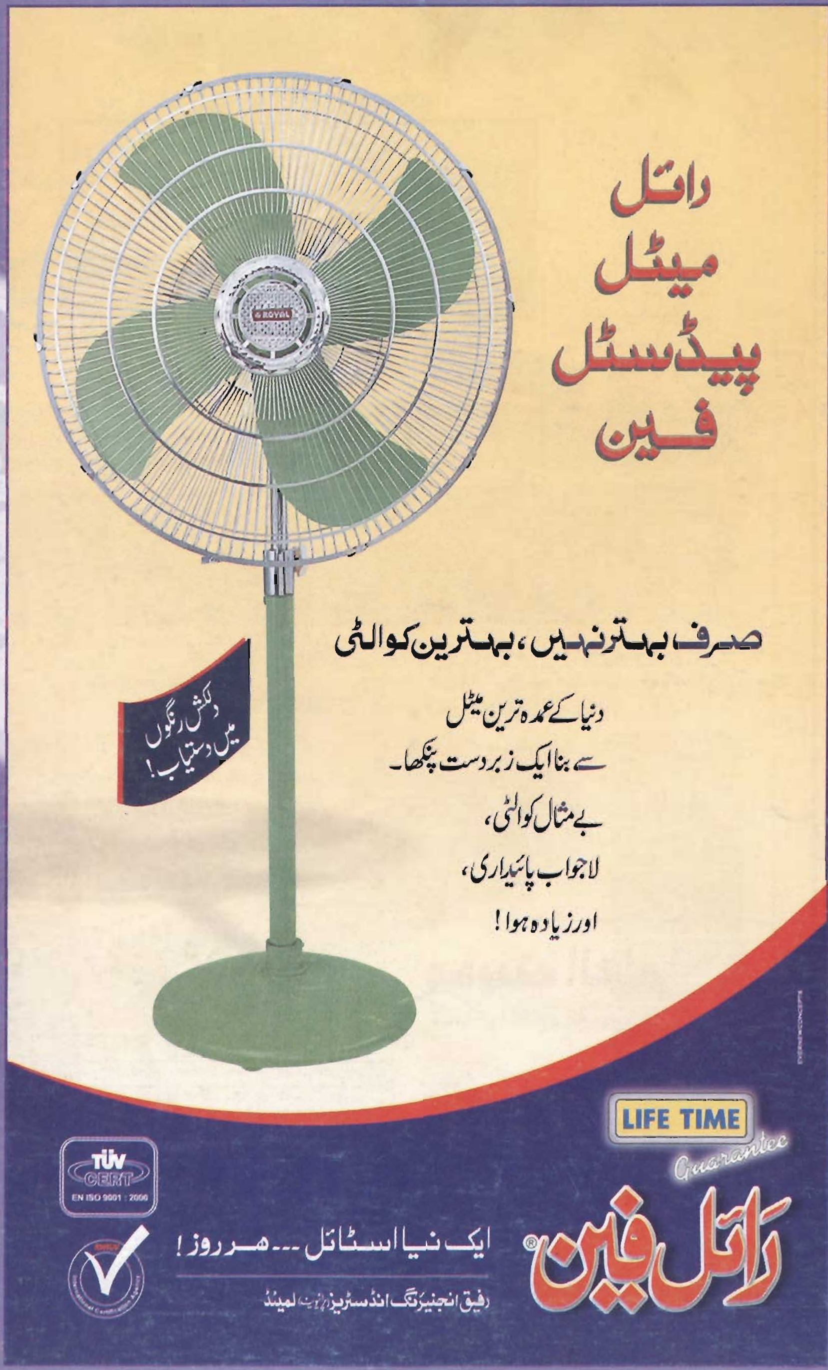
معقول مشاہرہ اور مراعات' سنگل اٹیچ باتھ رہائش' قیام وطعام فری

ڈاکٹر محمد اقبال چیئرمین / رئیس الجامعہ

مولانا فصیح اللہ مدنی فاضل مدینہ یونی ورسٹی
صدر مدرس

فون دفتر: 0693-63362-65216 رہائش: 0693-62219-65219

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا


رائل
میٹل
پیڈسٹل
فین
صرف بہتر نہیں، بہترین کوالٹی
دلکش رنگوں میں دستیاب!
دنیا کے عمدہ ترین میٹل
سے بنا ایک زبردست پنکھا۔
بے مثال کوالٹی،
لاجواب پائیداری،
اور زیادہ ہوا!
LIFE TIME
Guarantee
TÜV CERT
EN ISO 9001 : 2000
رائل فین
ایک نیا اسٹائل --- ہر روز!
رفیق انجینئرنگ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ